اعتبارِ حرف

انتخاب و ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر اسد فیض

اعتبار حرف

(ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مضامین کا انتخاب)

ترتیب و تھذیب

ڈاکٹر اسد فیض

دبستان سے الگ تاریخ اک لہجہ سکھاتی ہے
ہر اک کو اعتبارِ حرف یوں ملنے نہیں پاتا

(عزیز حامد مدنی)

ضابطہ

کتاب : اعتبارِ حرف

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مضامین کا انتخاب

ترتیب : ڈاکٹر اسد فیض

ناشر : ایشیاء پبلشرز امین پور بازار فیصل آباد

تقسیم کار

شہاب پبلشرز

بی ایم سنٹر، گلی نمبر 11 فسٹ فلور، منشی محلہ امین پور بازار فیصل آباد

فون: 0300-6662019 -0301-7053203

قیمت : -/150 روپے

انتساب

قابل احترام ہستیوں

امی اور

ابو

کے نام

فہرست

فہرست

مقدمہ

(ا)

تنقید ایک سنجیدہ عمل ہے۔ نقاد مصنف کے ذہنی سفر کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے فن پارے کی تفہیم پر قادر ہو سکتا ہے بلکہ اپنے مطالعے کی وسعت اور ذوق علم و ادب کے تحت وہ تصنیف کے منفرد گوشوں کو طشت از بام کر کے تخلیقی نقاد کے مرتبہ پر فائز ہونے کا اہل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی معاصر ادب کے لمحہ موجود میں ایک اہم اور منفرد ادبی شخصیت ہیں۔ ان کا کام کئی جہتوں پر محیط ہے وہ صرف ایک ادیب ہی نہیں دانشور، نقاد، محقق اور شاعر بھی ہیں۔ اپنے عہد کے علمی و ادبی حالات، تصورات اور تغیرات پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اردو ادب کی تاریخ اور روایت کا واضح احساس اور شعور بھی رکھتے ہیں اس مجموعے میں ان کے چند تنقیدی مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے یہ ملک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور ہمارے ادب کی ان جہتوں کو نمایاں کرتے ہیں جو انسان دوستی، زندگی کی تعبیر و تفہیم اور روشن خیالی سے عبارت ہیں اور زندہ روایت سے بھی تعلق رکھتی رہیں جن کا اظہار اور تسلسل ہمارے ادب کی تاریخ کو وقیع بناتا ہے ان سے آج کا تخلیقی منظرنامہ معتبر ٹھہرتا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں "ادب کے دو متضاد نظریات کے حامل کردار، مسعود حسن رضوی اور جوش ملیح آبادی" میں اردو ادب کی دو نامور شخصیات کی زندگی کے احوال سے ان کے ادبی رویوں اور کاوشوں کے اصل جوہر کو تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

"پاکستان میں غالب شناسی کی روایت" ایک اور اہم مضمون ہے۔ غالب کے بارے میں عام طور پر یہ ہی تاثر ملتا ہے کہ وہ ہندوستان کا شاعر ہے اور اقبال پاکستان کا، لیکن ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے مضمون میں اس تاثر کی حقیقی روح کو آشکار کر کے ایک ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ پاکستان میں بھی اردو کے اس عظیم شاعر کے فکر و فن پر بے پناہ لکھا گیا ہے اور پاکستان میں غالب شناسی کی روایت بے حد توانا ہے۔ انہوں نے محنت کے ساتھ غالب پر لکھی جانے والی کتب اور مقالات کی فہرست بھی اس مضمون میں پیش کی ہے اور ان کے مندرجات کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ اسی نوعیت کا جائزہ انہوں نے نیاز فتح پوری کے جریدہ "نگار" میں سرسید شناسی کے حوالے سے رقم کیا۔ یہ ایک معلوماتی مضمون ہے۔ جس مین سرسید شناسی کے لئے "نگار" کی خدمات کا نہ صرف جائزہ لیا گیا ہے بلکہ مضمون نگاروں کی آراء کا

بھی تجزیہ کیا گیا ہے اس ہی تسلسل میں ایک اور اہم مضمون " مطالعہ فرید کے دس سال " ہے۔ جس میں 1990ء سے 1999ء تک ہونے والے تحقیقی و تنقیدی کام کا تذکرہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک اہم مقالہ ہے جسے نہایت محنت اور عرق ریزی سے تمام کتب کے حوالے جمع کر کے تحریر کیا گیا ہے۔ یہ اداروں کے کرنے کا کام ہے جسے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے تن تنہا انجام دیا ہے یہ مضامین اردو ادب کے لئے قابل قدر اثاثہ ہیں اور اس نوعیت کے دیگر موضوعات پر مزید کام کی دعوت دیتے ہیں۔ " پاکستان میں اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری " اور سرائیکی ادب میں مزاحمتی رویئے " دو اور اہم مضامین اس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں دونوں اہمیت و افادیت کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ ان سے پاکستانی ادب کے مجموعی رویوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ موخرالذکر مضمون میں سرائیکی ادب میں مزاحمتی رویوں کی شناخت اور عکاسی ملتی ہے۔ جس سے پاکستان کے اِس زرخیز اور خوبصورت علاقے کی محرومیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

" سرائیکی اور اردو کا مشترکہ لسانی منظر نامہ " میں اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں اس خطہ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے لسانیات کے موضوع پر ایک اور مضمون " اردو زبان اور قومیت کی تشکیل " ہے جو ہماری قومی زندگی کے تناظر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کے نفاذ کے سلسلے میں درپیش مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس مجموعے کے لئے منتخب کئے گئے دیگر مضامین میں جو شعرا کے حوالے سے لکھے گئے ہیں ان شعرا کے فکر و فن کی نئی جہتوں کو تلاش کیا گیا ہے جن پر بے حد کم لکھا گیا ہے لیکن ان شعرا کی شاعری زندہ رہ جانے والے عناصر کی عمدہ مثالیں رکھتی ہے ان میں قتیل شفائی، شیر افضل جعفری، مجید امجد اور ظہور نظر کے نام شامل ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ان مضامین میں فکر و فن کا جو امتزاج دکھائی دیتا ہے وہ بجا طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ادب ان کے نزدیک ایک عظیم تہذیبی مشن ہے۔ اس لحاظ سے ان کی یہ تحریریں نئے تنقیدی رویوں کا پیش خیمہ ہیں۔ اپنے ادبی مسلک کے لحاظ سے وہ حقیقت پسند ہیں۔ یہ رویہ ان میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنا جلوہ دکھاتا رہا ہے جبکہ ان کی تنقید میں جمالیاتی تنقید کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن ان کے تصور نقد میں مختلف دبستانوں سے استفادہ کا رجحان بھی ان کی تنقید کا اہم ترحوالہ بنتا ہے جسے امتزاجی تنقید سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ کسی فن پارے کو جانچنے یا اس کی تعبیر و تفہیم

کے لئے اس دبستان کا فن پارے پر اطلاق کرتے ہیں جس کا وہ تقاضا کرتا ہے اس کے نتیجے میں فن پارہ اپنے تمام تر وجود کی افادیت و اہمیت کے ساتھ اپنے اسرار و رموز تہہ در تہہ قاری پر منکشف کرتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مضامین نقد میں تاثراتی، نفسیاتی اور ترقی پسند تنقید سے استفادے کا رجحان نسبتاً زیادہ ہے۔ اس طرح ان کے تنقیدی مضامین عصر حاضر کے جدید تنقیدی رویئے سے متصف ہو کر قاری کے لئے بصیرت اور آگہی کے نئے دریچے وا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس کتاب کے لئے ان کے منتخب کئے گئے مضامین کی ایک اور افادیت یہ ہے کہ یہ ان کے ادبی و تخلیقی رویوں کے بھرپور عکاس مین جن میں ان کی ادبی شخصیت کے مکمل ارتقاء کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے زیادہ تر معاصرین پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی تنقید کا یہ بڑا وصف ہے کہ وہ ہر طرح کے تعصب سے پاک اور بے لاگ ہوتی ہے اور چونکہ وہ شاعر بھی ہیں اس لئے ان کی نثر ایک خاص طرح کی جاذبیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ نئے الفاظ، تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی ان کے اسلوب کی ایک منفرد خوبی ہے خاص طور پر مضامین کے عنوانات کی انفرادیت ان کی پہچان ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین اردو ادب کے متنوع موضوعات تاریخ، ادب، تحقیق اور تنقید کے امتزاج پر مبنی ہیں جن کی اپنی افادیت اور اہمیت ہے اس لحاظ سے اردو ادب کے قاری اور مورخ دونوں کے لئے یہ لائق توجہ ہیں۔

شعراء پر تنقیدی محاکمے اردو کے قدیم اور جدید شعرا کے فکر و فن کی دریافت نو کے مصداق ہیں۔ خواجہ غلام فریدؒ پر کام کو بھی ڈاکٹر طاہر تونسوی نے حرز جاں بنا رکھا ہے۔ اس خطہ سے تعلق کے سبب انہوں نے اسے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے اور فریدیات کا یہ رنگ ان کی تحریروں میں یوں رس بس گیا ہے کہ ان کی شناخت بھی بن گیا ہے۔ اپنے عہد کے تناظر میں اپنے موضوعات کی انفرادیت، دانشوری کی منفرد گہرائی اور تخلیق کی سچائی کی بدولت وہ اپنے عہد کے سچے اور کھرے ادیب ہیں اور ادبی تہذیب کے ایسے نمائندے ہیں جو مسلسل لکھنے کا عذاب سہہ رہے ہیں اور اپنی رشحات قلم سے اردو ادب کو باثروت بنا رہے ہیں خدا کرے کہ ان کا صریر خامہ تا دیر نوائے سروش رہے۔

(۲)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے اب تک سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ان کے تحقیقی و

تنقیدی مضامین ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔	تجزیے	14
۲۔	رجحانات	13
۳۔	ہم سخن فہم ہیں	22
۴۔	لمحہ موجود ادب اور ادیب	42
۵۔	تحقیق وتنقید۔ منظر نامہ	13
۶۔	افکار و تجزیات	12
۷۔	تذکرہ کتابوں کا	

(چونکہ اس مجموعے سے کوئی مضمون نہیں لیا گیا اس لئے اس کی تعداد درج نہیں کی گئی)

پہلے چھ مجموعوں میں مقالات کی تعداد 116 بنتی ہے میں نے ان 116 مضامین میں سے صرف ایسے اٹھارہ مضامین منتخب کئے ہیں جو مجموعی طور پر ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تحقیقی اور تنقیدی رویوں کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ان کے نظریات کے عکاس بھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے باقی مقالات ان خصوصیات کے حامل نہیں ان کے سارے مقالات اور مضامین اردو ادب میں ایک مستند حوالہ ہیں تاہم ایک کڑے انتخاب کے لئے میں نے ایسے مضامین منتخب کئے ہیں جن سے ان کی تحقیقی وتنقیدی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔

میرے ان مرتبہ مضامین کے بارے میں نامور نقاد اور محقق ڈاکٹر خلیق انجم اور معروف ترقی پسند نقاد ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی گراں قدر آراء کا اظہار کیا ہے جس کی بدولت اس کتاب کی توقیر میں اور اضافہ ہوا ہے۔ میں ان دونوں دانشوروں کا ممنون ہوں علاوہ ازیں میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ان مضامین کو منتخب کر کے کتابی شکل میں چھاپنے کی اجازت دی ہے میں ایشیاء پبلشرز فیصل آباد کا بھی احسان مند ہوں کہ جس نے میری اس کاوش کو عملی جامہ پہنایا۔

ڈاکٹر اسد فیض

اسسٹنٹ پروفیسر

اسلام آباد، ماڈل کالج فار بوائز، سیکٹر G-11/1، اسلام آباد

تاثرات

ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں یکساں شہرت اور مقبولیت حاصل ہے اور جن کی ادبی کاوشوں کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کا نام بھی شامل ہے۔

طاہر تونسوی صاحب کی ادبی خدمات کی کئی جہات ہیں وہ شاعر، نقاد، ادیب، محقق، خاکہ نگار، کالم نگار اور مترجم ہیں اور ہر میدان میں انہوں نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

طاہر صاحب پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان کے تنقیدی، تحقیقی اور دوسرے موضوعات پر مضامین کی بھی ہے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر لکھا ہے۔ سرسید، سید مسعود حسن رضوی ادیب اور فیض احمد فیض، وغیرہ پر اُن کے خصوصی مطالعے کے موضوعات رہے ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی شخصیات اور فنون پر اظہار خیال کیا ہے۔

اُن کے تنقیدی مضامین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پوری ادبی دیانت داری کی ساتھ اور کسی بھی طرح کی عصبیت سے بلند ہو کر فن پاروں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ ایک اعلا جے کے ذمہ دار اور باشعور نقاد کی حیثیت سے وہ ادب کا جائزہ عصری سیاق میں اور اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تناظر میں بھی جائزہ لیتے ہیں۔

انہوں نے تحقیق کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تحقیق ایک طرف تو دیدہ ریزی چاہتی ہے اور دوسری طرف سند کے بغیر کوئی بات کرنا تحقیق کے مزاج

اور اس کی اخلاقیات کے خلاف ہے۔ طاہر تونسوی صاحب نے تحقیقی موضوعات پر اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ تحقیق کے تقاضوں اور محقق کی ذمے داریوں کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ تحقیق میں ماخذ کی چھان بین، ان کے مستند ہونے کی توثیق اور اس کے ساتھ اپنی ترجیحات کے ساتھ صرف اُن ماخذ سے استفادہ جو ہمارے دائرہ کار میں آتے ہیں یہ اہم نکات ہیں۔ طاہر تونسوی صاحب کے تحقیقی مقالات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی تحقیقی کاوشوں میں ان نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں ان کے ساتھ وہ سہولت کی خاطر محض ثانوی ماخذ سے کام چلاتے ہوئے آگے بڑھنے کے قائل نہیں۔ ان کی کوشش زیادہ تر یہ ہوتی ہے وہ بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کریں۔ اس کی بہترین مثال اُن کی کتاب سید مسعود حسن رضوی ادیب ہے۔ یہ اُن کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ اس مقالے کی تیاری کے دوران انہوں نے لکھنؤ میں رہ کر مسعود صاحب کے بارے میں اُن کے ہم عصروں اور دوستوں سے معلومات حاصل کیں اور مسعود صاحب کے صاحبزادے پروفیسر نیر مسعود کی وساطت سے مسعود صاحب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کیا۔

غرض یہ ہے کہ طاہر صاحب کسی بھی موضوع پر کتاب لکھیں یا چھوٹا سا مقالہ۔ دونوں صورتوں میں کام کے علمی وقار اور اعلا معیار کو ملحوظ رکھتے ہیں اور جس دیدہ ریزی اور ذمے داری کے ساتھ وہ کام کرتے ہیں وہ اس میں کامیاب بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اظہارِ خیال

ڈاکٹر قمر رئیس

ہندوستان میں پاکستان کے جن ادیبوں اور محققین کو خاص احترام اور اعتبار حاصل ہے ان میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا نام حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک جب وہ دہلی آئے تھے تو وہاں کی دانشگاہوں کے اساتذہ اور اہل قلم ان کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ طلباء ان کی تصانیف اور تحریروں سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کی تحقیق میں معروضی تجزیہ علمی تلاش اور استدلال کی روشنی ہوتی ہے۔ تنقید میں ہمیشہ افہام و تفہیم کا سلجھا ہوا انداز و اسلوب قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی نثر میں شگفتگی اور روانی کے عناصر اسے انوکھے ڈھنگ سے جاندار بنا دیتے ہیں۔ سب سے اہم پہلو ان کی علمی اور ادبی دلچسپیوں کی ہمہ گیری ہے۔ قدیم ادبی سرمایہ سے لے کر جدید تر رجحانات اور رویے ان کی توجہ اور مطالعہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ پنجابی اور سرائیکی کے ادبی سرمایہ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک جانب صوفیاء کے ارشادات اور ان کی ہمہ گیر انسان دوستی انہیں متاثر کرتی ہے تو دوسری جانب ترقی پسند اور روشن خیال ادیب و شاعر بھی ان کے سنجیدہ مطالعہ سے محروم نہیں رہتے۔ کلاسیکی ادب، جدید ادب اور پاکستان کے لوک ادب کا وسیع سرمایہ سب یکساں طور پر ان کی دلچسپی کا محور بنے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال سے ان کی فکری جولانیوں کو خاص نسبت رہی ہے۔ طاہر تونسوی صاحب کی فعال شخصیت کا جو پہلو خاص طور پر متاثر کرتا ہے وہ ان کی علمی

لگن اور کثیر جہتی نظر ہے۔ وہ ہمہ وقت نہ صرف عملی طور پر بلکہ ذہنی اور فکری طور پر متحرک رہتے ہیں یہی وہ تڑپ اور استغراق ہے جو نثر، نظم، تحقیق، تنقید، خاکہ، انشائیہ الغرض ہر شعبہ اور ہر صنف میں ان کے جاندار نقوش کی حامل نظر آتی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علمی سفر کی کئی منزلیں ابھی باقی ہیں اور پختہ کاری کے کئی روشن مقامات ان کے منتظر ہیں۔

پاکستان میں غالب شناسی۔۔۔۔۔۔ایک جائزہ

تحریر: ڈاکٹر طاہر تونسوی

غالب اپنی حیات مستعار سے لے کر لمحہء موجود تک اپنے شخصی اور فنی حوالے سے ناقدین ادب کا مرغوب موضوع رہا ہے اور ہے کہ اسکی ہر ایک جہت کا بھرپور مطالعہ ہوا ہے اور اس کے لئے غالبیات اور غالب شناسی کی اصطلاح وضع ہوئی ہے۔ اس تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ غالب ہمیشہ غالب رہا تو بے جا نہ ہوگا۔ یوں غالب کا کمال یہ ہے کہ اسکی پیدائش (1767ء) کے اعتبار سے دوسو چھ سال اور وفات (1869) کے لحاظ سے ایک سو چونتیس سال گزرنے کے باوجود اس کے فکروفن کی نئی نئی جہات سامنے آتی جاتی ہیں اور ہر جہت کے ہر پرت پر خامہ فرسائی کی جارہی ہے۔ اس طرح اس کے زاویہ نگاہ کی وسعتیں سامنے آرہی ہیں اور یوں غالب کا مطالعہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جہاں تک مطالعہ غالب کا تعلق ہے تو بقول ڈاکٹر سلیم اختر "غالب شناسی کے دو پہلو قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ داخلی اور خارجی۔۔۔۔۔ داخلی پہلو غالب کی اپنی تحریروں، خطوط اور بعض اشعار سے تکمیل پاتا ہے۔ ایسی تحریریں جن میں اس نے اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ ایسے خطوط جن سے اگر ایک طرف تخلیقی شخصیت میں نرگسیت کی اساس اجاگر ہوئی تو دوسری طرف فکروفن اور زبان و بیان سے وابستہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے اشعار اور مقدمے بھی ہیں جن میں اس نے یہ انداز اس بنا پر تنقیدی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ غالب شناسی کی خارجی جہت اس کے بغیر گہرائی سے عاری نظر آئی گی۔ کیا غالب کی کسی ایسی سوانح عمری کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ جو خطوط غالب اور اشعار سے صرف نظر کر کے قلمبند کی گئی ہو۔ غالب شناسی کے خارجی پہلو نے ان لاتعداد اہل قلم کی تحریروں سے جنم لیا ہے جو ایک صدی سے زائد عرصہ سے غالب کی حیات اور فکروفن کو موضوع بناتے ہوئے داد نقد دے رہے ہیں۔" ظاہر ہے کہ غالب کی شخصیت اور اس کے فکروفن کی تنقید کے سلسلے میں انہیں دونوں پہلوں کو پیش نظر رکھ کر یہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب (27 دسمبر 1797ء تا 9 فروری 1869ء) اہل نقد و نظر کی تحریروں کا مرکز و محور ہے اور اس میں داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کی عمل کاری کو دخل ہے۔

اردو شعراء کے تذکروں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ غالب کا تذکرہ ان کی زندگی میں ہی شروع

ہو گیا تھا۔ اس لئے خوب چند زکاء کے عیار شعراء سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد کے آب حیات تک بھی تذکروں مین غالب غالب ہے۔ غالب کی وفات کے اٹھائیس برس بعد 1841ء میں غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ تقسیم برصغیر سے قبل غالب شناسی کے حوالے سے جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں محاسن کلام غالب سامنے آئی۔ اس سے قبل غالب کی زندگی میں ہی 1841ء میں غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ تقسیم برصغیر سے قبل غالب شناسی کے حوالے سے جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں محاسن کلام غالب (ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری)، غالب شکن (یگانہ)، غالب نامہ (ایس ایم اکرام)، غالب (غلام رسول مہر)، سرگزشت غالب (ڈاکٹر محی الدین قادری زور)، ذکر غالب (مالک رام) تفہیم غالب میں نئی جہات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ سرمایہ کم سہی مگر اس نقد و نظر کے حوالے سے غالب شناسی کو جدید پیرایہ اظہار اور تازہ بحیثیت شاعر اور شخص ہر رنگ میں دیکھنے کی سعی کی اور دکھانے کی کاوش بھی کی یوں غالب شناسی کی ایک توانا روایت پیدا ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد غالب شناسی میں بیش بہا اضافے ہوئے۔ مولانا غلام رسول مہر کی خطوط غالب اور آفاق حسین آفاق کی نادرات غالب، خطوط غالب کی اہم کڑیاں ثابت ہوئیں۔ غالب پر پہلی تنقیدی کتاب خلیفہ عبدالحکیم کی افکار غالب ہے جو 10 دسمبر 1954ء کو شائع ہوئی اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی غالب۔۔۔ فکر و فن 1961ء تنقید غالب میں اہم مقام کی حامل ہے اس کے بعد تواتر سے غالب شناسی پر کام ہوا۔ داخلی حوالے سے بھی اور خارجی تناظر میں بھی۔۔۔۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 45 پبلشروں نے دیوان غالب کے نسخے شائع کئے اور کلام غالب کی 24 شرحیں لکھی گئیں اس طرح غالب کے فکر و فن پر بے شمار کتابیں آئیں اور کئی حوالوں سے اہل نقد و نظر نے غالب کا مطالعہ کیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
1-	احمد پوری مقبول حسین	گفتہ غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 2003ء
2-	آفتاب احمد، ڈاکٹر	غالب آشفتہ نوا	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1989ء
3-	آفتاب احمد، ڈاکٹر	میر، غالب اور اقبال۔ تین صدیوں کی آوازیں	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1996ء

-4	احمد غریب نواز خان	مختصر غالب	ملک نذیر احمد، لاہور
-5	ادیب، مسعود حسن رضوی (مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی)	غالب تب اور اب	مقبول اکیڈمی لاہور 1991ء
-6	اصغر، غلام جیلانی	نذر غالب	سرگودھا اکیڈمی، سرگودھا 1969ء
-7	اشرف قدسی	وفات غالب کا سواں سال	ادارہ معاشرتی بہبود ساہیوال 1969ء
-8	اشرف، ڈاکٹر اے۔ بی	غالب اور اقبال	بیکن بکس ملتان 1988ء
-9	اشرف، ڈاکٹر اے۔ بی	میر، غالب اور اقبال۔ تقابلی مطالعہ	بیکن بکس ملتان
-10	اطہر رضوی	بیاد غالب	جاوداں کراچی 1995ء
-11	افصہ وحید	ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس	ابلاغ پبلشرز لاہور 2002ء
-12	اکبر حیدری	غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے	ادارہ یادگار غالب کراچی
-13	اکبر حیدری	نوادر غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 2003ء
-14	انور سدید	غالب کا جہاں اور	کاروان ادب ملتان 1986ء
-15	انیس ناگی	غالب ایک شاعر ایک اداکار	سنگ میل پبلیکیشنز 1987ء
-16	انیس ناگی	غالب پریشان	مکتبہ جمالیات لاہور 1996ء
-17	انیس ناگی	غالب کا مقدمہ پنشن	القمر انٹر پرائز اردو بازار لاہور 1996ء
-18	باجوہ چوہدری نبی احمد	شش جہات غالب	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس ملتان روڈ لاہور 1972ء
-19	بلخی، سید رفیع الدین	تجزیہ کلام غالب	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی 66-1965ء
-20	پرتو روہیلہ	نامہ ہائے فارسی غالب (سید اکبر علی ترمذی)	ادارہ یادگار غالب۔ کراچی 1999ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر / سال
21-	پرتو روہیلہ	باغ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ	بزم علم وفن اسلام آباد 2000ء
22-	تحسین فراقی، ڈاکٹر	غالب فکر و آہنگ	اردو اکیڈمی پاکستان لاہور 1996ء
23-	تصور، تسلیم احمد	غالب مزاح کی زد میں	سورج پبلشنگ بیورو لاہور۔
24-	جیلانی کامران	غالب کی تہذیبی شخصیت	خالد اکیڈمی راولپنڈی 1972ء
25-	حامد علی شاہ، ڈاکٹر سید	غالب کا سائنسی شعور	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ 1995ء
26-	حبیب الرحمٰن	غالب فکر و فن کے آئینے میں	مکتبہ شاہین خیبر بازار پشاور 1976ء
27-	حسن اختر۔ ڈاکٹر ملک	حیات غالب کا ایک باب، تحقیق کی روشنی میں	مکتبہ عالیہ، لاہور 1987ء
28-	حقی شان الحق	آئینہ افکار غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 1969ء
29-	حمید احمد خان	مرقع غالب	مجلس ترقی ادب لاہور 2003ء
30-	حنیف نقوی ڈاکٹر	غالب نظر اور نظارہ	ادارہ یادگار غالب کراچی 2003ء
31-	خالد بزمی، خالد شفیق	یادگار غالب	مجلس اردو لاہور
32-	خالد حمید، ڈاکٹر	غزلیات فارسی غالب (منظوم اردو ترجمہ)	بزم علم وفن اسلام آباد 2000ء
33-	خورشید علی خان	فکر غالب (اشعار کے آئینے میں)	ذیشان کتاب گھر، کراچی 1997ء
34-	داؤدی، خلیل الرحمٰن	یادگار غالب	مجلس ترقی ادب لاہور 1963ء
35-	دہلوی محمد الیاس ناصر پیر	شرح دیوان غالب	2003ء
36-	ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین	محاسن خطوط، غالب	مکتبہ خیابان ادب لاہور 1969ء
37-	راز گجراتی، غلام حسین چوہدری	تذکرہ غالب اور غالب پسند آم	درسی پرنٹنگ پریس، گجرات 1973ء

38- راشدی، حسام الدین	دود چراغ محفل	ادارہ یادگار غالب، کراچی 1969ء
39- رشید حسن خان	املائے غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 2002ء
40- رشید حسن خان	انشائے غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی
41- رضوی، علی مظہر	غالب نام آور	مجلس یادگار غالب حیدر آباد
42- ریاض صدیقی	غالب برانہ مان	اسری پبلیکیشنز کراچی 1992ء
43- زیدی، سید نظیر حسنین	غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامیں	مسعود اکادمی، نظام آباد کراچی 1963ء
44- ساجدہ پروین	اشاریہ خطوط غالب حصہ دوم	شعبہ اردو گورنمنٹ کالج، لاہور
45- سجاد مرزا	غالب نکتہ بیں	فروغ ادب اکادمی گوجرانوالہ 1992ء
46- سجاد باقر رضوی	غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں	مجلس یادگار غالب لاہور۔ 1969ء
47- سحر انصاری	ذکر غالب ذکر عبدالحق	ادارہ یادگار غالب کراچی 1971ء
48- سلطان صدیقی	عرفان غالب	الحمراء اکیڈمی لاہور 1972ء
49- سلیم احمد	غالب کون	مکتبہ المشرق کراچی 1971ء
50- سلیم اختر، ڈاکٹر	شعور اور لاشعور کا شاعر	فیروز سنز لاہور۔
51- سلیم اختر، ڈاکٹر	غالب شناسی اور نیاز و نگار	الوقار پبلی کیشنز، لاہور 1998ء
52- سہیل بخاری، ڈاکٹر	غالب کے سات رنگ	آزاد بک ڈپو لاہور 1970ء
53- سیال، محمد حیات خان	احوال ونقد غالب	نذر سنز لاہور 1967ء
54- سید عبداللہ، ڈاکٹر	اطراف غالب	مکتبہ کارواں لاہور 1979ء
55- شاہد، ڈاکٹر محمد ایوب	شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ حصہ اول و دوم	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 1888ء
56- شجاع ناموس، ڈاکٹر	بزم فردوس	شیخ مبارک علی لاہور

57-	شریف الحسن	غالب کون ہے؟	نگارشات لاہور 1988y
58-	شوکت تھانوی	غالب کے ڈرامے	ادارہ فروغ اردو لاہور 1951ء
59-	شوکت سبزواری	فلسفہ کلام غالب	انجمن ترقی اردو کراچی 1969ء
60-	شہابی انتظام اللہ	غالب کے لطیفے	مشتاق بک کارنر لاہور
61-	صارم الازہری	مقام غالب	ادارہ علمیہ لاہور 1968ء
62-	صدیقی، رشید احمد	غالب نکتہ داں	مکتبہ دانیال کراچی 1997ء
	(مرتبین: مہر الٰہی ندیم)		
63-	صدیقی شمس الدین	خیابان غالب	عظیم پبلشنگ ہاؤس پشاور
64-	ضیاء اسلام پوری،	غالب وتلمیحات غالب	خضر اردو، طارق منزل موچھ
	حمید اللہ خان		میانوالی 1992ء
65-	ظفر الحسن مرزا	تماشائے اہل کرم	ادارہ یادگار غالب کراچی 1969ء
66-	عارف بٹالوی	غالب کے رومان	الفلاح پبلی کیشنز لاہور 1969ء
67-	عاصمہ اعجاز	غالب نامہ۔ تجزیاتی مطالعہ	شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور 1994ء
68-	عبادت بریلوی	غالب کا فن	اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور 1968ء
69-	عبادت بریلوی	غالب اور مطالعہ غالب	ظفر سنز لاہور۔ 1969ء
70-	عبد الحکیم خلیفہ	افکار غالب	مکتبہ معین الادب لاہور 1954ء
71-	عثمانی، پیر حاجی شریف احمد	ذکر غالب	مکتبہ معین الادب لاہور 1954ء
72-	عدنی، افتخار احمد	غالب شناسی کے کرشمے	الوقار پبلی کیشنز لاہور 1995ء
73-	عروج، عبد الروف	بزم غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 1969ء
74-	فاروقی، نثار احمد	تلاش غالب	ادارہ فروغ اردو، لاہور-1970ء
75-	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	غالب شاعر امروز وفردا	اظہار سنز، لاہور 1970ء

-76	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب	حلقہ نیاز ونگار کراچی 1995ء
-77	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	شرح ومتن غزلیات غالب	بیکن بکس ملتان 2000ء
-78	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	تعبیرات غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی
-79	فیاض نیازی	لطائف غالب	خان اکیڈمی، لاہور 1966ء
-80	فیاض محمود	تنقید غالب کے سوسال	مجلس یادگار غالب لاہور 1969ء
-81	قادری، محمد ایوب ڈاکٹر	غالب اور عصر غالب	غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی 1995ء
-82	قادری حامد حسن مولانا	غالب کی اردو نثر اور دوسرے مضامین	ادارہ یادگار غالب کراچی
-83	قدرت نقوی، سید	غالب کون ہے؟	امروز پرنٹنگ پریس ملتان
-84	قدرت نقوی، سید	نسخہ شیرانی اور دوسرے مقالات	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 1988ء
-85	قدرت نقوی، سید	غالب آگہی	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 1992ء
-86	قدرت نقوی سید	غالب صد رنگ	ادارہ یادگار غالب کراچی
-87	قریشی، سمیع اللہ	غالب کی نفسیات غم	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 1992ء
-88	قیصر، سید ابن حسین	غالب نما	ادارہ یادگار غالب، کراچی 1969ء
-89	کرار حسین، پروفیسر	غالب سب اچھا کہیں جسے	ادارہ یادگار غالب، کراچی 1969ء
-90	کلیم، محمد موسیٰ خان	مقام غالب	نقوش پریس لاہور۔ 1965ء
-91	کوثر، ڈاکٹر انعام الحق	مرزا غالب کتابیات (حصہ اول)	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1987ء
-92	گوریجہ، ڈاکٹر رشید احمد	خصوصی مطالعہ غالب	بیکن بکس ملتان 1996ء
-93	گوہر نوشاہی، ڈاکٹر	مطالعہ غالب	مکتب عالیہ لاہور 1991ء
-94	گوہر نوشاہی، ڈاکٹر	غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور۔ سرکاری دستاویزات 1805-1869	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1998ء

-95	گیان چند جین، ڈاکٹر	رموز غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 1999ء
-96	گیان چند جین ڈاکٹر	غالب شناس مالک رام	ادارہ یادگار غالب کراچی
-97	گیلانی، ڈاکٹر سید عارف شاہ	شہنشاہ سخن	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی 1970ء
-98	لاڑ، سجاد احمد	غالبیات	فہیم اکیڈمی، راجن پور 1990ء
-99	لطیف الزمان خان	مکتوبات غالب	الفیصل اردو بازار، لاہور 1995ء
-100	لطیف الزمان خان	غالب شخصیت و کردار	ادارہ یادگار غالب کراچی 1999ء
-101	مجنوں گورکھپوری	غالب۔ شخص و شاعر	مکتب ارباب قلم کراچی 1974ء
-102	محمد اکرام شیخ	غالب نامہ	مکتبہ اردو بازار لاہور 1939ء
-103	محمد اکرام شیخ	حکیم فرزانہ	فیروز سنز لاہور 1957ء
-104	محمد بشیر، مرزا	سرگزشت غالب	پائینر پریس کراچی
-105	محمد عاشق میجر	غالب پی ٹی گورس پر	عارف پبلی کیشنز لاہور 1967ء
-106	مخمور آبادی، محمود رضوی	سرو و صنوبر	مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی
-107	مشفق خواجہ	غالب اور صفیر بلگرامی	دی مطبوعات کراچی 1981ء
-108	مطلوب الحسن سید	منتخب کلام غالب (منظوم انگریزی ترجمہ)	الوقار پبلی کیشنز لاہور 2000ء
-109	معین الرحمن، ڈاکٹر سید	غالب اور انقلاب ستاون	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1972ء
-110	معین الرحمن، ڈاکٹر سید	اشاریہ غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی 1969ء
-111	معین الرحمن، ڈاکٹر سید	تحقیق غالب	اردو اکیڈمی سندھ کراچی 1981ء
-112	معین الرحمن، ڈاکٹر سید	جاگیر غالب	مکتبہ کارواں لاہور، 1994ء
-113	معین الرحمن، ڈاکٹر سید	لطائف غیبی	الوقار پبلی کیشنز لاہور۔ 1995ء
-114	معین الرحمن، ڈاکٹر سید	غالب کا علمی سرمایہ	یونیورسل بکس لاہور۔ 1989ء

-115	معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید	نقوش غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور 1995ء
-116	معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید	غالب پیمائی	الوقار پبلی کیشنز لاہور 1998ء
-117	معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید	بازیافت غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور 1999ء
-118	مقصود حسنی	لسانیات غالب	ناشر شیر ربانی ٹاؤن قصور 1999ء
-119	ممتاز حسن	جہات غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی
-120	ممتاز حسین	غالب ایک مطالعہ	انجمن ترقی اردو کراچی 1969ء
-121	نادم سیتاپوری	خیابان غالب	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی 1970ء
-122	نادم سیتاپوری	غالب کی کلام میں الحاقی عناصر	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی 1970ء
-123	نادم سیتاپوری	غالب نام آور	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1970ء
-124	ناصر الدین ناصر	دبستان غالب	مکتبہ الفتح لاہور 1969ء
-125	ناصر عابدی	سرگزشت غالب	الکتاب کراچی 1965ء
-126	نائلہ انجم	رسالہ نقوش میں ذخیرہ غالبیات	الفیصل لاہور 1989ء
-127	نجیب جمال، ڈاکٹر	غالب شکن اور یگانہ	کاروان ادب ملتان 1990ء
-128	نجیب جمال، ڈاکٹر	ماہ و سال عندلیب	سطور پبلی کیشنز ملتان 1997ء
-129	نذیر علی شاہ	آیات غالب	مکتبہ جدید پریس لاہور 1965ء
-130	نذیر احمد	محاسن الفاظ غالب	کتابیات لاہور 1969ء
-131	نذیر محمد خان	غالب	مکتبہ دانیال کراچی 1985ء
-132	نذیر علی شاہ، بریگیڈیر	آیات غالب	ادارہ حلیمہ سعدیہ عرفانیہ بہاولپور
-133	نیاز فتح پوری	غالب فن و شخصیت	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی 1987ء
-134	نیر پرویز	کائنات غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور 2003ء
-135	وحید قریشی، ڈاکٹر	نذر غالب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

-136	وزیر آغا، ڈاکٹر	غالب کا ذوق تماشا	اقبال اکیڈمی لاہور 1997ء
-137	وقار عظیم سید (مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)	وقار غالب	گورا پبلشرز لاہور
-138	ہاشمی حمید اللہ	گفتۂ غالب	مکتبہ دانیال لاہور 2003ء
-139	ہما اخلاق	اشاریہ خطوط غالب حصہ اول	شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور 92-1991
-140		غالب حالات و انتخاب	فیروز سنز، لاہور 1968ء
-141		غالب	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
-142	یاد، مشکور حسین سید	غالب بوطیقا	الحمد پبلیکیشنز لاہور 1998ء
-143	یاد، مشکور حسین سید	غالب کا ذوق الٰہیات	ذوالفقار علی شمیر لاہور 1999ء
-144	یاد، مشکور حسین سید	غالب کی طبع نکتہ جو	کلاسک لاہور 2002ء

ان تصانیف و تالیفات اور مرتبات کی فہرست اس بات کا منظر نامہ تشکیل دیتی ہے کہ ان میں غالب کی سوچ و فکر کے نئے دھارے تلاش کیے گئے ہیں اور اشعار کی معنی آفرینی کے بے شمار پہلو اجاگر کیے گئے ہیں اور اس کی زندگی کے ہر پل کو تنقیدی نقطۂ نظر سے نجانچا گیا ہے اور اس کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں مسعود حسن رضوی نے غالب تب اور اب کا سراغ لگایا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے اسے آشفتہ نو کہا۔ ڈاکٹر انیس ناگی نے اسے شاعر سے زیادہ اداکار قرار دیتے ہوئے غالب پریشان گردانا۔ جیلانی کامران نے غالب کی تہذیبی شخصیت کو کھنگالا۔ سلیم احمد نے غالب کون کا نعرہ بلند کیا۔ شریف الحسن اور سید قدرت نقوی نے استفسار کیا کہ غالب کون ہے؟ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسے شعور اور لاشعور کا شاعر کہہ کر اس کے آتش زیر پا ہونے کا نفسیاتی پہلو ڈھونڈ نکالا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اسے شاعر امروز فردا بتایا۔ چوہدری نبی احمد باجوہ نے شش جہات غالب، سید رفیع الدین بلخی نے تجزیہ کلام غالب، سلطان صدیقی نے عرفان غالب، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اطراف غالب، شوکت سبزواری نے فلسفہ کلام غالب، عبدالصمد صارم نے مقام غالب، ناصر الدین ناصر نے دبستان غالب، ڈاکٹر وحید قریشی نے نذر غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے نقوش

غالب، سید وقار عظیم نے وقار غالب میں غالب کے فلسفے، اس کی شاعری، اس کی نفسیاتی الجھنیں اس کی تصوف، اس کی ہمہ گیریت اس کی ہنر مندی، اس کی انا پسندی، اس کی نرگسیت، اس کا تصور حسن و عشق اور اس سے متعلقہ موضوعات پر کھل کر اظہار کیا ہے۔

1997ء میں غالب کو دو صدیاں بیتی ہیں۔ اس سال کے حوالے سے غالب پر بہت سا کام ہونا چاہیئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے 1997ء غالبیات پر ہونے والے کا کام گراف کھینچا ہے اور صرف چھ کتابیں چھپ کر سامنے آئیں۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، وقار غالب (سید وقار عظیم کے مضامین) مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالب کا ذوق تماشا از ڈاکٹر وزیر آغا، ماہ و سال عندلیب از ڈاکٹر نجیب جمال اور غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور۔۔۔ سرکاری دستاویزات 1805ء تا 1869ء از ڈاکٹر گوہر شاہی اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں اور کئی نئے پہلوؤں اور حوالوں سے غالب کی شخصیت اور فن افادیت کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں اور کئی نئے پہلوؤں اور حوالوں سے غالب کی شخصیت اور فن دونوں کو اجاگر کیا گیا ہے اور ان مضامین و مقالات میں غالب کی نئی معنویت کو تلاش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے غالبیات پر کام کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ چنانچہ سید مشکور حسین یاد نے جو انشائیہ، طنز و مزاح اور مزاحیہ شاعری کے حوالے سے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں بڑی سنجیدگی سے غالب کو اپنی سوچ و فکر کا محور بنایا ہے اور نئے تناظرات میں غالب کا مطالعہ کیا ہے۔ یوں غالب کا ذوق الہیات اور غالب کی طبع نکتہ جو فکر کا محور بنایا ہے اور نئے تناظرات میں غالب کا مطالعہ کیا ہے۔ یوں غالب کا ذوق الہیات اور غالب کی طبع نکتہ جو فکر غالب کی تشریح و توضیح کے نئے مباحث کو جنم دیتی ہیں اور اچھی بات یہ ہے کہ ان سے اختلافات کے پہلو بھی نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید مشکور حسین یاد کے مطالعات اور نتائج دانشوروں میں موضوع گفتگو بھی ہیں اور موضوع تحریر بھی۔ غالب کے اشعار کی معنویت کو سامنے لانے کے لئے خورشید علی خان کی کتاب فکر غالب (اشعار کے آئینے میں) ایک منفرد نوعیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب شرح و متن غزلیات غالب، غالب کی شرحوں میں بیش بہا اضافہ ہے اور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی بھرپور کاوش ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں غالب پیمائی اور بازیافت غالب از ڈاکٹر سید معین الرحمان، رموز غالب از ڈاکٹر

گیان چند جین، غالب شخصیت اور کردار از پروفیسر لطیف اللہ، غالب فکر و آہنگ از ڈاکٹر تحسین فراقی، منتخب کلام غالب (منظوم اردو ترجمہ) از ڈاکٹر خالد حمید اور لسانیات غالب از مقصود حسنی قابل تحسین ہیں۔ غالب کے خطوط پر بھی خاصا کام ہوا ہے۔ چنانچہ نامہ ہائے فارسی غالب سید اکبر علی ترمذی/ پرتو روہیلہ باغ دودر میں شامل غالب کے فارسی خطوط (اردو ترجمہ) از پرتو روہیلہ بڑی اہم ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر حمید اللہ ہاشمی بھی غالب شناسوں میں شامل ہوئے ہیں اور انہوں نے دیوان غالب کی شرح گفتہ غالب کے نام سے شائع کی ہے اور اس میں بیخود موہانی کی شرح کی طرح آسان، سادہ اور عام فہم اندازہ میں غزلیات غالب کے معنی درج کیے ہیں اس طرح غالب کی تفہیم آسان ہوگئی ہے اور اس پر غور کرنے کے بعد تشریحی اور توضیحی معانی سمجھنے کے لئے مراحل بڑی سہولت کے ساتھ طے کیے جا سکتے ہیں۔ یوں دیکھیں تو بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی "غالب نے جدید فکر کے لئے پرتپاک فضا مہیا کرنے کے لئے کام کیا تھا۔ جنگ آزادی کے دوران اجڑے دیاروں کے ملبے پر بیٹھ کر اتنی دور کی کوڑی لانا واقعتاً چاند پر پہنچنے کے مترادف ہے۔ ہمارے غالب شناسوں نے غالب کی اس جدید فکر کا نہ صرف ژرف بینی سے تجزیاتی مطالعہ کیا۔ بلکہ نئے عہد کے اس نقیب کی ہر بات اور ہر ادا کو قرطاس وقلم کے ذریعے محفوظ کر دیا" یہاں یہ بات قابل فخر ہے کہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی نے 1969ء میں غالب پر سترہ کتابیں شائع کیں۔ پاکستانی یونیورسٹیوں نے غالب پر تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی چنانچہ سندھ یونیورسٹی نے 1972ء میں غالبیات کا تحقیقی و توضیح مطالعہ کے موضوع پر سید معین الرحمٰن کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی پہلی ڈگری عطا کی اس کے بعد 1986ء میں پنجاب یونیورسٹی نے محمد ایوب شاہد کو ان کے مقالے شارحین دیوان غالب (اردو شروح کا تقابلی مطالعہ) پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری دی۔ ایم۔ اے کی سطح پر بھی غالب شناسی اور غالب شناسوں پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔

پنجاب یونیورسٹی میں کتابیات متعلقہ غالب، خطوط غالب (اردو) اردو رسائل کے غالب نمبر، غالب کی امیجری، کلام غالب میں فکری عناصر، مطالعہ غالب انیسویں صدی میں، ڈاکٹر ایس ایم اکرام بطور غالب شناس، مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس، غالب کا فارسی کلام، رسالہ نقوش میں ذخیرہ غالبیات، مالک رام بطور غالب شناس آل احمد سرور بطور غالب سناس، ڈاکٹر شوکت سبزواری بطور غالب شناس، مولانا

مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی بطور غالب شناس، توضیحی اشاریہ خطوط غالب، اردو کلام غالب کا ابجدی اشاریہ، غالب نامہ تجزیاتی مطالعہ، ڈاکٹر مختار الدین احمد بطور غالب شناس، ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس، ڈاکٹر سید عبداللہ بطور غالب شناس، سید وقار عظیم بطور غالب شناس، کالی داس گپت رضا بطور غالب شناس، ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس طلبہ کی تحقیق کا موضوع بنے۔

سندھ یونیورسٹی نے غالب کے اثرات شعرائے مابعد پر، غالب پر بیدل کے اثرات، غالب کا علمی ماحول ان کے خطوط کے آئینہ میں، یادگار غالب کی شخصیات اور فکر غالب کا ارتقائی جائزہ پر کام کرایا۔

کراچی یونیورسٹی نے اشاریہ غالب "مدح و قدح کی روشنی" از صباح الدین عبدالرحمن اور نیاز و نگار اور غالب شناسی پر مقالے لکھوائے۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں غالب کے سفر، غالب کی سوانح عمریاں، دیوان غالب، موضوعاتی تدوین، غالب کا تنقیدی شعور، خطوط کے آئینے میں۔ جیسے موضوعات پر تحقیق و تنقیدی کام ہوا۔

علمی و ادبی رسائل نے اپنی بساط کے مطابق غالب نمبر نکالے جو غالب شناسی میں ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سارا کام 1969ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ہوا۔ ایسے رسائل میں صحیفہ، اردو، ماہ نو، نقوش، قومی زبان، افکار، مہر نیمروز، نگار، ادب لطیف، غالب، ھلال، عکس لطیف، نقش، الشجاع، العلم، سب رس، خیابان، تحقیق نامہ، اردو نامہ، اوراق، فنون، نئی قدریں، الزبیر، ہمدرد ڈائجسٹ، راوی، افشاں، کارواں اور منشور کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ صحیفہ نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں غالب پر پانچ شمارے شائع کیے جبکہ "اردو" نے جمیل الدین عالی اور مشفق خواجہ کی ادارت میں غالب پر پانچ شمارے چھاپے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں نگار کے تین شمارے اشاعت پذیر ہوئے۔ دوسرے دانشوروں کی تخلیقات پر مبنی غالب نمبر اس کے علاوہ ہیں۔ "نقوش" کے محمد طفیل نے دو غالب نمبر شائع کیے۔ دوسرا نمبر غالب کی بیاض پر مشتمل ہے۔ جو بذات خود ایک حیرت انگیز دریافت ہے۔ نقوش کے غالب نمبر فروری 1969ء میں محمد طفیل نے طلوع کے نام سے جو اداریہ لکھا ہے اس کی آخری سطریں یوں ہیں "قصہ صرف اتنا ہے کہ غالب اتنا بڑا آدمی نہ تھا جتنا بڑا شاعر تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب سے اب تک

بڑے آدمی بے شمار گزرے مگر ان سب میں غالب ایک تھا۔۔۔ایک رہا۔

رسائل کے نمبر کے حوالے سے اہم بات یہ بھی ہے کہ "ماہ نو" اور "قومی زبان" ہر سال فروری میں غالب کے لئے مخصوص گوشہ شائع کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بار بھی قومی زبان کا 184 صفحات پر مشتمل غالب نمبر شائع ہوا ہے۔ اسی طرح پر دین ملک کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ماہ نو، 264 صفحات پر مشتمل ایک غالب نمبر شائع کیا ہے۔ جس میں دیوان غالب بھی شامل ہے۔ رسائل کے غالب نمبر کا تذکرہ ہوا ہے تو اس حوالے سے ماہنامہ سورج لاہور کا 1108 صفحات پر مشتمل غالب نمبر جسے تسلیم احمد تصور نے مرتب کیا ہے۔ ایک ایسی دستاویز ہے جو غالب شناسی میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آنجہانی پرتھوی چندر کی مایہ ناز کتاب "جاگیر غالب" کو شامل کیا گیا ہے اس طرح اپنے نام سے جعلی ایڈیشن لانے والے غالب شناس کی قطعی بھی کھل گئی ہے۔ غالب کی دو صدیاں 1997ء میں گزریں اور اس دوران دیوان غالب کی دریافت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے دیوان غالب کے نسخہ خواجہ کو کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ دیوان غالب کا یہ نسخہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے نومبر 1998ء میں مرتب کیا تھا اور اگست 2000ء میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ اس کا ڈیلیکس ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ نسخہ لمحہ موجود تک نزاعی صورت احوال اختیار کئے ہوئے ہے اور اس کے بارے میں کئی کتابیں اور کتابچے سامنے آئے جن میں اعتراضات کی بوچھاڑ کی گئی ہے اس طرح اعتراضات کے جوابات اور اس کی حمایت کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا اور چھاپا گیا ہے اس صورت حال پر بغیر کسی تبصرے کے صرف ریکارڈ کے لئے ان کی فہرست درج کی جا رہی ہے۔

دیوان غالب (نسخہ خواجہ)

معین الرحمٰن سید ڈاکٹر	دیوان غالب نسخہ خواجہ	گورا پبلشرز لاہور 1998ء
		الوقار پبلشرز لاہور 2000ء
تحسین فراقی، ڈاکٹر	دیوان غالب نسخہ خواجہ اصل حقائق	سورج پبلشنگ بیورو لاہور 2001ء

ثاقب عارف، ڈاکٹر	دیوان غالب نسخہ خواجہ اصل حقائق از تحسین فراقی اور دیوان غالب نسخہ خواجہ۔ صحیح صورت حال از معین الرحمٰن ایک تقابلی جائزہ	اظہار سنز لاہور۔ 2000ء
سید قدرت نقوی	دیوان غالب، نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ	مکتبہ تخلیق ادب کراچی 2000ء
جعفر بلوچ / رفاقت علی شاہد (مرتبین)	محاکمہ دیوان غالب نسخہ لاہور (مسروقہ)	علم و عرفان پبلشرز لاہور 2001ء
معراج نیر ڈاکٹر سید / اصغر ندیم سید	دیوان غالب، نسخہ خواجہ تجزیہ و تحسین	الوقار پبلی کیشنز لاہور 1999ء
معین الرحمٰن، سید ڈاکٹر	دیوان غالب نسخۂ خواجہ اصل صورت حال	الوقار پبلی کیشنز، لاہور 2000ء
وقار معین سید	بر سبیل غالب	الوقار پبلی کیشنز، لاہور 2000ء

غالب شناسی کے سلسلے میں جو اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اس کے حوالے سے اس تمام تحقیقی و تنقیدی کام کا تجزیہ کیا جائے تو ایک حوصلہ افزا صورت اور توانا روایت سامنے آئی ہے خاص بات یہ ہے کہ غالب شناس پروفیسر لطیف الزمان خان کا غالب سے عشق غالبیات پر کام کرنے والوں کو نیا حوصلہ دیتا ہی اور پھر ان کی غالب لائبریری اس پر مستزاد ہے کہ مس فرح ذبیح نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے "لطیف الزمان خان کے کتب خانے میں ذخیرہ غالبیات" کے عنوان سے ایم۔فل اردو کے لئے ایک ضخیم مقالہ لکھا ہے جس کے نگران کا ڈاکٹر طاہر تونسوی تھے یہ مقالہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان شائع کر رہی ہے۔

جیسا کہ میں نے آغاز میں لکھا ہے کہ غالب شناسی کی روایت 106 برسوں پر محیط ہے اس سلسلے میں ایک بار پھر تسلیم احمد تصور نے زوردار دھماکہ کیا ہے کہ دوصد سالہ جشن غالب کے حوالے سے ماہنامہ سورج لاہور کا 1192 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے اور یہ جلد دوم ہے اس دستاویز میں غالب کے خطوط غالب شناسوں کی نظر میں، تلاش غالب، غالب ڈرامے، نقد غالب اور نوادرات غالب کی عنوان سے مقالات اور تحریریں، یک جا کر دی گئی ہیں اور بعض کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں سورج کے پہلے نمبر کی طرح اس میں بھی دو

خصوصی پیش کش شامل ہیں آنجہانی پرتھوی چندر کی کتاب "مرقع غالب" اور خواجہ حسن نظامی کا مرتبہ غالب کا روزنامچہ۔۔۔۔۔۔خاص بات یہ ہے کہ اس میں جلد سوم کے چھاپنے کی نوید بھی دی گئی ہے۔اس تناظر میں یہ بات برملا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان میں مقدار و معیار دونوں حوالوں سے غالب پر عمدہ کام ہوا ہے اور غالب شناسی کی روایت دن بدن توانا ہوتی جا رہی ہے اور یہ جائزہ غالب کے اپنے فرمان کے مطابق زندہ اور روشناس خلق کا روشن آئینہ ہے یوں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ غالب کون ہے؟

تاثراتی دبستانِ تنقید کا تخلیق کار ...... میرؔ

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کس سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کہتے تو تھے یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ان اشعار کی زبان، ان کا لب ولہجہ، ان کا اسلوب اور ان کے موضوعات کا تنوع اور خیالات کی ہمہ گیری، جذبات و احساسات کا بہاؤ، تجربات و مشاہدات کا سیل رواں اور باطن سے ابھرنے والی دردمندی اس بات کی غماز ہے کہ ان سب کا تخلیق کار خدائے سخن میر تقی میرؔ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ میرؔ جس کا فرمایا ہوا مستند ہے اور جو سارے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ میرؔ کی اس بات پر زمانے اور وقت کا قیاس نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ میرؔ کی شاعری آفاقی ہونے کے سبب میزان وقت کی قید سے بالاتر ہے۔ ویسے تو ایک زمانہ میرؔ کی عظمتوں کا معترف ہے تاہم ان کی شخصی کمزوریوں اور ان کی نفسیاتی وذہنی الجھنوں کی بنا پر کئی ایسے اہل دانش بھی ہیں جو زمانے بھر کے اس اعتراف سے اختلاف رکھتے ہیں۔ گو اس سے میرؔ کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرؔ تو میرؔ تھا اور میرؔ تو میرؔ ہی رہے گا۔ اور اس کے نام کے تینوں حرف م، ی، ر حرف ابجدی خصوصیات کے اعتبار سے خاص اہمیت کے

حامل ہیں۔ اوران پر ہی لسانی تشکیلات کا درومدار ہے۔ لفظ و معنی اور ان کی پرکھ پڑچول کے حوالے میرؔ کے بارے میں گفتگو مقصود ہے تو منظر یوں ہے کہ ادبستان دین دیال روڈ لکھنؤ کے ڈرائنگ روم میں مسعود حسن رضوی اور جوش ملیح آبادی کے درمیان غزل کے بارے میں مکالمہ ہو رہا ہے۔ جوشؔ کہہ رہے ہیں ''دو مصرعوں میں کوئی نفسیاتی تجربہ تکمیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مسعود حسن رضوی کہہ رہے ہیں۔ جوشؔ صاحب یہاں پر ''سکتا'' کا لفظ آپ نے بہت غلط استعمال کیا ہے جو عمل بارہا ہو چکا ہو اس کے امکان پر غور کرنا چہ معنی دارد۔ غزل کے بے شمار شعر ایسے ہیں جن میں شاعر نے اپنا کوئی نہ کوئی نفسیاتی تجربہ تکمیل کے ساتھ بیان کیا ہے دیکھئے عہد شباب کے متعلق ایک شاعر اپنا نفسیاتی تجربہ بیان کرتا ہے۔ ذرا بتایئے یہ بیان نامکمل تو نہیں ہے۔

ہر چیز پر بہار ہر شے پہ تھا نکھار
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

شباب کے متعلق ایک اور شعر سنیئے:

آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویر شباب
یاد پھر آگئی بھولے ہوئے افسانے کی

اور اب خود اپنے ایک نفسیاتی تجربے کو دیکھئے کہ ایک غزل گو شاعر نے بھی وہی تجربہ بیان کیا ہے۔ آپ کی ایک نظم ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے سب لوگ مجھ کو چاہتے تھے، ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے لیکن اب سب میرے مخالف ہو گئے ہیں جہاں تک غور کرتا ہوں اس تبدیلی کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اب میرا شعور پختہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ نظم مجھے یاد نہیں۔ غزل کا شعر ہوتا تو یاد ہو جاتا بہر حال آپ کی ایک نظم کا یہی مفہوم ہے۔

جی ہاں! جی ہاں!

اب میں غزل کا شعر پڑھنے جا رہا ہوں اسے سنیئے کہ اس میں بھی تجربہ بیان ہوا ہے۔ اور آپ کی پوری نظم سے زیادہ تکمیل کے ساتھ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔۔ پھر وہی ہو سکتا۔۔ جناب یہ ہو چکا ہے۔۔ اچھا ارشاد! اور خیال رہے کہ یہ آپ کا ذاتی تجربہ ہے لہذا

اسے تکمیل کے ساتھ بیان ہونے کے متعلق آپ سے بہتر کون فیصلہ کر سکتا ہے۔ یقیناً یقیناً سنائیے صاحب! وہ کونسا شعر ہے۔

اور یہ بھی دیکھئے گا کہ اس شعر میں صرف نفسیاتی تجربہ ہی بیان نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ ذاتی تاثر کی جھالر بھی لگی ہوئی ہے۔ ارے صاحب وہ شعر سنایئے تو! اور یہ تاثر الگ سے نہیں ٹانکا گیا ہے بلکہ شعر میں سمویا ہوا ہے۔ افوہ! آپ تو اشتیاق بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ صاحب وہ شعر! اور واضح رہے کہ یہ غزل کا شعر ہے کسی نظم کا نہیں، ایک غزل گو شاعر۔

مسعود صاحب! کسی طرح سنا چکیے۔

بہتر ہے ملاحظہ ہو:

باولے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی

جوشؔ صاحب جھوم جھوم گئے۔ چار پانچ مرتبہ شعر کو پڑھوایا پھر پوچھا کس کا شعر ہے۔ کسی شاعر کا نہیں کہنے والا ایک غزل گو ہے۔

کون؟

وہی بڈھا میرؔ جسے آپ شاعر نہیں مانتے۔

اس طویل مکالمے کے درج کرنے کا مقصد میرؔ کی شاعری کی ہمہ گیری، وسعت اور تجربات سے معموری کا منظر نامہ تشکیل دینا تھا۔ اور اس سے دکھانا یہ ہے کہ میرؔ کے ہاں بے پناہ تخلیقی فعالیت اور شعری بصیرت تھی اور یہ دونوں کیفیات ایک فن کار کے ہاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ اپنے فن کو عہد موجود کے معیارات سے آگاہی رکھتا ہو۔ میر کی شخصیت اور شاعری دونوں سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ میرؔ کے ہاں شعری اور تنقیدی بصارتیں تمام تر تخلیقی سطحوں کے حوالے سے موجود تھیں۔ اس تناظر میں جو تخلیق کار سامنے آیا اس میں تنقیدی شعور، اُپج اور پرکھ کی خصوصیت موجود تھی اور وہ اپنے عہد کی تمام تر ادبی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی صورت حال سے نہ صرف واقف تھا بلکہ

اس کا گہرا شعور بھی رکھتا تھا۔ اس لحاظ سے اس نے اپنے عہد کی ادبی، فنی اور شعری کیفیات کو ''نکات الشعراء'' کے نام سے ایک دستاویز میں اس طرح رقم کیا ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس طرح ''نکات الشعرا'' میرؔ کے ہاں تنقیدی شعور اور شاعری کے فن پر نظریات و افکار کی نشاندہی کرتا ہے جس میں اس دور کے شاعروں، ادبی محفلوں، رجحانات اور رویوں، شعری نشستوں اور ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں واشگاف الفاظ میں تذکرہ ملتا ہے۔ میرؔ کے ہاں تنقیدی شعور اور فنی شعور پر تفصیل سے گفتگو کرنے اور اس کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ میرؔ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ نہ تو لحہ موجود کی اصطلاح کی مطابق نقاد تھے اور نہ ہی پیشہ ور نقاد تھے۔

بلکہ یہ تو ایک ایسا اضافی کام یا کارنامہ ہے جو ان سے سرانجام پا گیا ہے اور انہوں نے اس عہد کی زندگی اور اس سے پیدا شدہ معمولات و معاملات پر تنقید تو کی، مگر وہ مکمل طور پر ادب کے ناقد نہیں تھے البتہ تذکرے کے ذیل میں انہوں نے عصری رجحانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، نکات الشعرا کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ میرؔ اظہار و ابلاغ کے مروجہ سانچوں اور شعری اصناف کے فنی تقاضوں سے پورے طور پر آگاہ تھے خاص طور پر ایک تخلیقی فن کار ہونے کے ناطے تحسین شعر کے ماہر تھے۔ سکاٹ جیمز نے لکھا ہے ''تنقید کی ایک ایسی قسم بھی ہے جو خود فن کی تخلیق سے قبل موجود ہوتی ہے اور فن کی نوع پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے تنقید کی ایک قسم فن کو اپنا موضوع بناتے ہوئے فن کے بعد معرض وجود میں آتی ہے۔ ان میں وہی فرق ہے جو زندگی کی تنقید اور تنقید کی تنقید میں ہوتا ہے گویا بلحاظ فکر موخر الذکر کے مقابلے میں اول الذکر کو تقدیم حاصل ہوتی ہے۔ فن پارہ موجود نہیں تو اس پر تنقید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ بالکل بدیہی ہے کہ ایسا کوئی فن پارہ نہیں جس نے تنقید سے قبل ہی جنم لیا ہو۔

میر تقی میرؔ کی تنقیدی اور فنی اساس بھی اس کلیے اور قاعدے کے تحت نظر آتی ہے بلکہ وہ خود اپنے کلام کے ناقد تھے اور عصری شعور پر ان کی گہری نظر تھی۔ سماجیات کے ضمن میں ان کے اپنے تجربات اور مشاہدات تھے۔ معاشرتی صورت حال کے وہ خود عینی شاہد

تھے اور پھر ان پر جو بیت رہی تھی اس کے وہ خود ہی گواہ تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تخلیق وتنقید دونوں سطحوں پر جو انکشاف کیا اس میں اُن کی ذہنی اور تخلیقی وتنقیدی اپج سبھی شامل تھی۔

''نکات الشعراء'' کی تنقیدی آراء اشعار کی مثالوں اور بعض اشعار پر میرؔ کی اصلاحوں کے تناظر میں ان کے نظریۂ ادب وفن اور معیارات فن اور نقد ونظر کے معیارات قائم نہیں ہوئے تھے اور پھر اُردو جو ریختہ کے حصار سے بھی نہیں نکلی تھی تاہم تذکروں میں جو تنقیدی رویے نظر آتے ہیں انہیں جمالیاتی، رومانی اور تاثراتی دبستان تنقید کے اولین نقوش قرار دیا جاسکتا ہے مگر پھر اہم بات یہ ہے کہ عربی اور فارسی کی مستحکم روایت کے پیش نظر لفظ ومعنی کی پرکھ اور جانچ کا ملکہ ضرور حاصل تھا۔ اس لیے اس دور کی اور خاص طور پر میرؔ کی تنقید کو تذکرۂ تنقید قرار دے کر رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں ایک طرح سے بھرپور توانائی موجود ہے اور لفظ کا ضیاع کئے بغیر دو چار جملوں میں اس پر تنقیدی رائے ظاہر کی جاسکتی ہے۔ باقی تو پھر تشریحات وتوضیحات کی ذیل میں آتا ہے۔ مثلاً صاحب آب حیات کا یہ جملہ ''میرؔ کا کلام آہ اور سوداؔ کا واہ ہے'' اب اس آہ اور واہ کی تشریح وتوضیح کے لیے دفتر درکار ہیں اور آج بھی یہ دونوں لفظ ہماری تنقید کی اساس دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے میرؔ آج کے مفہوم میں ناقد نہیں تھے اس لیے انہوں نے کہیں بھی اپنے تنقیدی نظریات کا الگ سے اور کھل کر اظہار نہیں کیا۔ بلکہ تخلیقی شعور کے حوالے سے یہ باتیں سامنے آتی رہی ہیں۔ اور انہیں سامنے رکھ کر ان کے تنقیدی شعور کا پتہ لگ سکتا ہے۔ زبان، الفاظ، اسلوب، صنائع بدائع، مذاق شعری اور ادبی ماحول اور خیالات کی شعور رو کے پس منظر میں تشبیہات واستعارات کے تناظر میں۔

۱۱۳۵ھ میں میرؔ پیدا ہوئے اور ۱۱۶۵ھ میں ''نکات الشعرا'' کی تکمیل ہوئی۔ گویا یہ تنقیدی دستاویز میرؔ کی تیس سال کی عمر کی کمائی ہے اور ایک اعتبار سے ان کا اولین نقش بھی ہے مگر اسے میرؔ کی جوانی کی کاوش قرار دے کر رد نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ اس کے پس منظر میں شعر وادب کی جو توانا روایت موجود تھی میرؔ اسی میں پلے بڑھے تھے اور

بلاشبہ سب کچھ یہ فارسی اور عربی کی مروجہ روایت اور اصول تنقید کے پس منظر میں تھا۔ میرؔ کی تنقید نگاری کے نمونے دیکھیے:

''باغ نکتہ دانی کے آب و رنگ، گلزار معانی کی چمن بندی کرنے والے، زور طلب بلاغت کے مالک کے حاکم، میدان فصاحت کے پہلوان شاعر اور گفتگو کی صفائی کے خاندان کے چراغ۔ ان کا سا زبردست شاعر قادر الکلام اور عالم فاضل اب تک ہندوستان جنت نشاں میں پیدا نہیں ہوا۔ آپ نے تفریح طبع کے طور پر کبھی کبھی ریختہ کے دو تین شعر کہہ کر اس بے وقعت اور بے اعتبار فن کو جسے ہم لوگوں نے اپنا رکھا ہے۔ اہمیت اور اعتبار بخشا ہے۔''

(سراج الدین علی خان آرزو)

''سلیم و کلیم سے کم مرتبہ نہیں حالانکہ شعر کہنا ان کے مرتبہ کی توہین ہے لیکن کبھی کبھی اس فن کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں۔''

(مرزا مظہر جان جاناں)

''نہیں تارے بھرے ہیں شک کے لفظ اس قدر نسخہ فلک ہے غلط اگر بجائے اس قدر کے کس قدر کہا ہوتا تو شعر نہایت بلند ہو جاتا۔''

(شاہ مبارک آبرو)

''میاں آبرو کے ہمعصر، ان کی طبیعت ایہام گوئی کی طرف بہت زیادہ مائل نہیں اس لیے ان کے اشعار بے وقعت اور بے مزہ ہیں۔''

(میاں احسن اللہ)

''ان کی زبان بہت تکلیف پہنچانے والی تھی''

(جعفر زٹلی)

''ہندی شاعروں کے سرتاج ہیں اور نہایت خوش گو، ان کے ہر شعر

میں بلا کا لطف بھرا ہوا ہے اور ان کے الفاظ کی چمن بندی میں گل معنی کے دستے کے دستے لگے ہوئے ہیں۔ سروآزاد ان کے ہر برجستہ مصرع کا غلام ہے اور ان کے فکر عالی کے سامنے ہر کس کی طبع عالی بھی شرمندہ ہے۔''

(سودا)

''ریختہ کے زبردست شاعر ہیں ان کا طرز کسی سے نہیں ملتا۔ آپ کے تہہ دار اشعار کو سمجھنے کے لیے عاجز۔ جن لوگوں کی فکر قطعاً قاصر ہے ان کی طبع رواں ایک سیل رواں کی مانند اور ان کی فکر رسا آسمان کی سی بلند ہے۔ آپ کی فکر کے بازو کمان معنی کو زور سے کھینچنے والے ہیں آپ کے پیچیدہ اور پر اثر شعر اس تیر کی طرح ہیں جو بال کی بھی کھال کھینچے۔''

(کلیم)

''اگرچہ محفل سخن میں ابھی نو وارد ہیں لیکن ان کے قلم کی بان پر معنی کی فوج کا ہجوم رہتا ہے۔ چمن تلاشوں کے لیے ان کی رنگین فکر او ربہار کا یہ سایہ ہے۔ اور ان کے ہر مصرع کی بندش چنار کی تازگی کا لطف رکھتی ہے۔ بحر خفیف میں ان کا ہر شعر جگر پر نشتر چلاتا ہے۔''

(میر سجاد)

''ان کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ مرزا اظہر ان کو شعر کہہ کر دیتے ہیں۔ اور وہ ریختہ کے ان اشعار کا وارث خود کو بتاتے ہیں اس بات کو قبول کرنے میں بندہ کو ہنسی آتی ہے...... ان سے میری ملاقات کے بعد اتنا تو معلوم ہو گیا کہ وہ شعر سمجھنے کی صلاحیت قطعاً نہیں رکھتے۔''

(انعام اللہ یقینؔ)

''ان کی رنگین زبان برگ گل سے بھی زیادہ صاف ستھری ہے۔ اور آپ گلستان سخن کے نازک دماغ بلبل ہیں۔ ان کے کلام کا رنگ دیکھ کر میری زبان سے برجستہ ان کے کمال کی تعریف نکل جاتی ہے۔''

(میر عبدالحیٔ تاباں)

ان کا اپنا ایک الگ انداز ہے لیکن میرے تخلص کے لے لینے کی وجہ سے میرا دل آدھا خوش ہے۔''

(محمد میر)

ان مثالوں سے میر تقی میرؔ کے معیار سخن اور تنقیدی شعور کا منظر نامہ تشکیل دینا آسان ہو جاتا ہے اور ان کی پسند و ناپسند اور قبول و رد کی صورت حال بھی سامنے آ جاتی ہے اور اچھی شاعری کے لیے ان کے پیش نظر جو معیارات تھے، ان کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہوتا اور ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

الف۔ میر نکتہ دانی کے ساتھ ساتھ زباندانی کے بھی قائل ہیں۔

ب۔ وہ میدان فصاحت اور گفتگو کی صفائی کے حامی ہیں۔

ج۔ ان کے نزدیک قادر الکلامی اور علم و فضل کی بڑی اہمیت ہے۔

د۔ شعر کہنے کو وہ بے مصرف فن گردانتے ہیں۔

ر۔ شعر میں لطافت اور فکر عالی کو بڑی خوبی تصور کرتے ہیں۔

ف۔ طبع رواں اور فکر رسا کو اہمیت دیتے ہیں۔

ق۔ تازگی فکر اور لطف بیان کو تسلیم کرتے ہیں۔

ک۔ شاعر اور تشاعر کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔

ل۔ کلام کے رنگ کا الگ ذائقہ محسوس کرتے ہوئے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہیں۔

م۔ انہیں یہ پسند نہیں کہ کوئی اور میر تخلص کرے۔

ن۔ شاعری میں سادہ طرز ادا مگر نثر میں مقفی اور مسجع عبارت لکھتے ہیں۔

و۔ اشعار کی معنویت اور تہہ داریت ان کے نزدیک خاص وصف ٹھہرتا ہے۔

ی۔ ابھرنے والے شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کو داد دے کر انہیں تسلیم کرتے ہیں۔

اوپر بیان کیے گئے نکات، ''نکات الشعرا'' میں صاف طور پر جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ موجودہ دور کی طرح معاصرین کے بارے میں تنقید لکھنا بڑا مشکل فن ہے مگر میرؔ نے کسی کی پروا کیے بغیر جرأت مندی اور کسی کی دل شکنی کے خوف سے بالاتر ہو کر بات کی ہے اور پھر میر بھلا کس کو ماننے والے تھے مگر نکات الشعراء میں اعترافی تنقید کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ جن کی بدولت ایک اور میر ہمارے سامنے آتا ہے جو کھل کر داد بھی دیتا ہے اور بے داد سے بھی گریز نہیں کرتا، یوں دیکھا جائے تو وہ نقاد کے منصب اور اس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ میرتقی میرؔ کے گہرے تنقیدی شعور کا اندازہ نکات الشعراء کے آخر میں دیئے گئے باب ''خاتمہ'' کے مندرجات سے بھی آشکار ہو جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ''میرؔ نے ''نکات الشعراء'' میں تنقید کے جن اصولوں پر بار بار زور دیا ہے ان میں ربط کلام، خوش فکری، تلاش لفظ، صفائی گفتگو، ایجاد مضامین، تہہ داری، دردمندی اور طرز احساس شامل ہے۔''

مولوی عبدالحق نے درست لکھا ہے'' اس میں عموماً اور اکثر شعرا کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ میرؔ صاحب پہلے تذکرہ نویس ہیں جنہوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے، بے رو و رعایت اس کا اظہار کر دیا ہے''

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے'' تنقید سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت سے متعلق اس قدر برجستہ اور واشگاف رائیں پائی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔''

مگر حیرت یہ ہے کہ کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر صفدر آہ نے میرؔ کی تنقیدی آراء سے

اتفاق نہیں کیا اور میرؔ کی تنقیدی بصیرت اور میرؔ کی زبان تنقید پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں ''میرؔ کی عبارت آرائی خود میرؔ کی شاعری تو مانی جا سکتی ہے لیکن اس میں شاعران مذکور کا قطعاً لا پتہ ہیں۔ یہ اعتراض میرؔ سے زیادہ اس عہد کے طرز نگارش پر ہے۔ کسی شاعر پر لکھتے ہوئے میرؔ کا احساس انشاپردازی ان کی تحریر کو غیر حقیقی بنا دیتا ہے'' مجھے اس بارے میں فقط یہی کہنا ہے کہ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر فارسی کی ساری شعری روایت اور عبارت آرائی کو رد کرنا پڑے گا اور فصاحت و بلاغت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ میرؔ تقی میرؔ نے جو معیار تنقید ''نکات الشعراء'' میں قائم کیا ہے اس پر وہ خود بھی پورا اترتے ہیں اور اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میرؔ
در سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

صناعِ طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میرؔ جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

اور میر نے زندگی کی ساری کیفیتوں سے جی لگا کر نہیں گیا۔ بلکہ سب ہنر کیا۔ اس اعتبار سے اس کے ہاں شعر شعور انگیز نکلتا ہے۔ جس طرح اس نے خود شاعری میں مختصر سے لفظ میں وسعت بیاں سمو دی ہے، اسی طرح شعور شاعری اور تنقیدی شعور کی بدولت دیگر شعرا کے ضمن میں اختصار سے کام لے کر اجمال میں تفصیل بیان کر دی ہے اور کف کوزہ گر کی صناعی نے شاعری اور اس سے پیدا شدہ محرکات کو جانچنے کے لیے معیارات بھی مقرر کیے ہیں اور ان کا اطلاق بھی کیا ہے۔ میرؔ نے غم عشق، غم حیات اور غم کائنات کی مثلث سے اپنی شاعری کی عمارت کی بنیاد رکھی ہے۔ اور تنقید شعر میں انہیں تینوں نکات کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے ہاں شاعری کے منصب اور اپنے عہد کے سماج اور عصری حیثیت کو جانچنے کی جو صلاحیت تھی، اس کی بنا پر اسے کہنا پڑا:

کن نیندوں سو رہی ہے تو اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

اس طرح کے دوسرے حیاتی تجربات جہاں میؔر کے گہرے تنقیدی شعور کا پتہ دیتے ہیں، وہاں ان کے سماجی شعور کا بھی علم ہوتا ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ سماج اور فن دونوں کے ناقد تھے۔ اور یہ دونوں پہلو ان کی شاعری اور نقد ونظر میں صاف طور پر اور بڑے فن کارانہ انداز میں دکھائی دیتے ہیں اس لیے ''نکات الشعراء'' کی تنقیدی حیثیت مسلمہ ہو جاتی ہے کہ میؔر نے اس میں سیرت اور فن دونوں حوالوں سے تخلیقی فن کاروں کا مطالعہ کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ اشاراتی طرز اور اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''نکات الشعراء'' کے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

''اس تذکرے سے اس حقیقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ میؔر بنیادی طور پر ایک ادبی انسان تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر بات ادب وشعر کے حوالے سے ہوتی تھی۔ وہ اپنے عہد کے ادبی وشعری ماحول کے خاموش تماشائی ہی نہیں تھے، اس کو بنانے سنوارنے اور آگے بڑھانے میں ان کی عظیم شخصیات کا بڑا حصہ ہے۔ میؔر نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور یہ سب کچھ انہی کی پہلودار شخصیت کی بدولت تھا کہ اُردو شاعری کے فن بے اعتبار کو اعتبار سے ہمکنار ہونے کا موقع ملا۔ یہ انہی کی کوشش کے نتائج تھے کہ اس زبان اور اس کی شاعری کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے آداب آئے۔ اس سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے تاہم میؔر اس کی شخصیت اور اس کے فن کا جدید نفسیات کی روشنی میں بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے شعوری، لاشعوری محرکات اور اس کی متنازعہ شخصیت کے پہلوؤں کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہوسکتا ہے۔ حسن عسکری لکھنوی نے اس حوالے سے جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کا تذکرہ یہاں ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اور میؔر کے احساسات اور تجربات جنہوں نے اس کی شاعری کا نقشہ مرتب کیا ہے، ان سے اس کے فکری معیار کا اظہار ہوتا ہے جس کی زد میں اس کی شخصیت بھی آ جاتی ہے یعنی وہ اپنی کمیوں کو بھی محسوس کرنے کی صلاحت رکھتا تھا۔ اور وہ خود کو بے دماغ کہتا تھا۔ اپنی بے دماغی کا اس کا یہ اعتراف بھی یہ ثابت نہیں کرسکتا ہے کہ میؔر نے اپنی شخصیت کا پورا تجزیہ کر کے اپنے آپ کو بے دماغ کہا ہے۔ میؔر کی اس بے دماغی سے جو علیحدگی کا تصور

وابستہ ہے، اس تصور کے بیچ میں مشاہدات و تجربات مذاق اور سوچنے کے طریقوں پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں ان کو میر نے مختلف مقامات پر مختلف طور سے اٹھایا ہے۔ یعنی اگر کوئی اس کے پاس شاگردی کی آرزو لے کر آیا ہے تو اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ آپ کا ذہن شاعری سے مناسبت نہیں رکھتا ہے...... اپج اور پرکھ کا سجایا ہوا وہ ذہنی حال جو حقیقتوں کو نمایاں کر کے صحت مند مذاق فن کی پیدائش کا فریضہ ادا کرتا ہے، میر کی خودگری نے اس میں اس فریضے کی ادائیگی کی زبردست صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ لہذا لفظ و عمل کے بیچ میں ظاہرداریوں اور وقتی مصلحتوں کا بڑا فرق رکھنے والی اخلاقی روایات کی پیروی میر کے بس کی بات نہ تھی۔ اس اقتباس سے جو باتیں کی گئی ہیں میر کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کے شخصی رویوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور ''نکات الشعرا'' میں یہ رویے کھل کر سامنے آئے ہیں اور اس میں میر ایک بے باک ناقد کے طور پر قابل تحسین ہیں۔

میر جب صد موسم گل کی تہ بال گزارنے اور بے بال و پری کا مقدر نہ دیکھنے کا رجائی رویہ (جو ان کی پوری شاعری کے بالکل برعکس ہے) اختیار کرتے ہیں، تو ان لفظوں سے ان کی ہمہ رنگ تخلیقی فعالیت، شعری صناعیت، عصری جبلت اور بے پناہ ایمائیت دلیل روشن ہو جاتی ہے۔ اور تنقید میں بھی اس کے یہی تخلیقی رجحانات اجاگر ہوتے ہیں۔ اس میں جمالیاتی، تاثراتی اور رومانی طرز احساس کی مکمل جھلکیاں ملتی ہیں۔ اور جب وہ اپنے منصب نقد و نظر کی جانب رخ کرتے ہیں تو اس میں وہ جو اسلوب تنقید اختیار کرتے ہیں اس کا جمالیات، تاثرات اور رومان سے گہرا ربط بن جاتا ہے۔ چنانچہ ''نکات الشعرا'' میں جمالیاتی تنقید کے ساتھ ساتھ تاثراتی اور رومانی نقطہ نظر کا اظہار بھی مل جاتا ہے:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
بھوت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

اس تناظر میں میر کے دواوین کے ساتھ ساتھ نکات الشعراء کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ اور لحۂ موجودہ میں بھی ان پر اعتماد اور اعتبار کیا جا سکتا ہے اس سے آج کے دور میں

جب معاصرین کے بارے میں لکھنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہو تو اس صورت میں میرؔ کی جرأت مندی اور بے باکی کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ اور میرؔ کے پرستار ہونے کے ناطے میں اس ناانصافی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس حوالے سے میرؔ کا یہ دعویٰ صحیح ہے:

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر ملے ہے

نیاز فتح پوری کا نظریہ شعر اور مصحفی

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا
مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

....

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کس کا خود سمندر
مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے
اے جان نکل کر مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

....

جھڑ پڑا داغ چمن میں جو کوئی لالے کا
ہم نے وہ داغ اٹھا اپنے جگر پر رکھا
میں اس رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ھائے
ہاتھ ہنگام قسم کیوں ترے سر پر رکھا
ترے بیٹھے جو ہمیں یاد کوئی کام آیا
ہم نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا

یہ اور اس طرح کی کچھ اور مثالیں مصحفی کے تخلیقی رویے اس کی سوچ وفکر کے زاویے اس کے شعری آہنگ

اور شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہیں اور یہ وہ رنگ ہے جسے رنگ مصحفی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یقینی طور پر اس رنگ اور اسی مزاج کی بنا پر نیاز فتح پوری کو مصحفی میں دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی وجہ سے نگار کا مصحفی نمبر نکلا۔ نیاز فتح پوری نے مصحفی سے اپنی اس دلچسپی اور اس کے شعروں کے اچھا لگنے کا تذکرہ "ملاحظات" میں کیا ہے، لکھے ہیں:

"میری وابستگی مصحفی و میر کے ساتھ مومن سے بھی پہلے کی ہے اور اس لئے اصولاً مجھے سب سے پہلے انہیں دونوں کو لینا چاہیے تھا لیکن میر کو میں نے اس لئے ترک کر دیا کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، اور کچھ اس لئے بھی کہ سورج کو سورج کہنے سے فائدہ کیا ہے۔ مصحفی کی طرف توجہ کرنے میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ اس کا کلام ملتا نہیں اور جو عام پورے بازار میں میسر آتا تھا وہ اتنا اور ایسا نہ تھا کہ اسے سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاتا۔ صرف ایک نسخہ جس میں کلام مصحفی کا انتخاب رام پور میں کیا گیا تھا کہیں کہیں مل جاتا تھا۔ لیکن وہ بہت ناقص و نامکمل تھا اور اسے دیکھ کر مصحفی کی شاعری پر کوئی حکم لگانا قرین انصاف نہ تھا اس کے بعد جب حسرت موہانی نے غیر مطلوبہ دواوین کا ایک انتخاب شائع کیا تو مصحفی کی شاعری کو سمجھنے کا کچھ موقع ملا۔"

(نگار: مصحفی نمبر ص ۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیاز فتح پوری کی مصحفی سے دلچسپی کافی پرانی ہے بلکہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں انہیں مصحفی کے شعر پڑھنے کا موقع ملا اور پھر مصحفی برابر ان کی مطالعے میں رہا اور یہ شوق مطالعہ نگار کے مصحفی نمبر پر منتج ہوا اور اس کی خاص بات فراق گورکھپوری کا وہ مقالہ ہے جس سے ہر اعتبار سے مصحفی کی بازیافت ہوئی اور ناقدین کو مصحفی کے اصل رنگ سخن کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ بقول نیاز فتح پوری"۔ "فاضل مقالہ نگار نے مصحفی کی شاعری کے کسی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور انتقاد عالیہ کا پورا حق ادا کر دیا ہے"۔

(نگار: مصحفی نمبر ص ۴)

بہر حال یہ طے ہے کہ نیاز فتح پوری کے پسندیدہ شاعروں میں ایک مصحفی بھی تھے۔ مصحفی کے فن شعر گوئی، زبان و بیان اور اسلوب کے بارے میں نیاز فتح پوری کے خیالات کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ شعر کے بارے میں نیاز فتح پوری کے نظریات کو ایک نظر دیکھ لیا جائے اور اس کے حوالے سے مصحفی کے کلام کو جانچا جائے تو مناسب ہوگا۔

نیاز فتح پوری نے شاعری اور شاعروں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کئی مقامات پر اپنے نظریات شعری کا اظہار بھی کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شعر اور شاعری کے لئے کن لوازمات کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

"جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ ان کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے اس کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا۔ اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ چونکہ میں اس دنیا کا آدمی ہوں جہاں الفاظ کا شرمندہ معنی ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس دنیا کے علاوہ میں کسی ایسی دنیا کا قائل نہیں ہوں جہاں معنی شرمندہ الفاظ نہیں ہوتے اس لئے میں یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم شاعری اور معصومیت دنیا کی جائے کیونکہ معصومیت کا تعلق محض لڑکپن سے ہے اور شعر نام ہے جوانی کا"

(انتقادیات: ص396)

"شاعر برا ہو یا بھلا، پیدا ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے میں کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھتا ہوں کہ وہ فطرت کی طرف سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے میں فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ قدرت نے اس کا دماغ کس نوع کی شاعری کے لئے وضع کیا تھا اور ماحول سے کس حد تک اس کی فطری افتاد کی موافقت یا مخالفت کی اور آخر کار نتیجہ کے لحاظ سے وہ کامیاب ہوا یا ناکام"

(انتقادیات: ص147-146)

"محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کے احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔ ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس وقزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اسی طرح کائنات میں قدرت کی جتنی مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے حواس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے۔ بشرط آنکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کو پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب ولہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں"

(انتقادیات: ص86-85)

"اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے اور اس کے بعد یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے۔"

(انتقادیات: ص295)

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے ہی الفاظ و انداز سے ظاہر کردے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور اسی کا نام ذوقِ سلیم ہے"

(انتقادیات: ص91)

"شاعر کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر اس کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہیے کم ہے"۔

(انتقادیات: ص300)

"انداز بیاں بھی ایک وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا ہے اور گفتگو کا لب ولہجہ پیدا کرنا مخصوص الفاظ کی مخصوص ترکیب ہی سے ممکن ہے علاوہ اس کے جذبات کی بلندی وثقاہت سب الفاظ اور انداز بیان پر منحصر ہے۔"

(انتقادیات: ص88)

"شاعری کا خون تصوف کے ہاتھ سے مجھے پسند نہیں اور میرا ہر شاعر سے خواہ وہ کسی رنگ کا ہو صرف یہ مطالبہ ہے کہ وہ جو خیال کرے ظاہر کرے لیکن یہ دیکھ کے کہ الفاظ سے وہ پوری طرح ادا بھی ہوتا ہے یا نہیں، اس کے بعد مرتبہ اسلوب بیان کا ہے"۔

(انتقادیات: ص298)

"شاعری کی اصل روح چاہے کچھ ہو لیکن اس روح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں وہ میری رائے میں صرف الفاظ کا "رکھ رکھاؤ" ہے۔"

(انتقادیات: ص296)

"شاعری کو کم از کم ایک نوع کی وجدانی تسکین کا ذریعہ ہونا چاہیے۔"

(انتقادیات: ص295)

"غزل گوئی کی وسعتیں زیادہ تر ہجر و فراق کی دنیا سے متعلق ہوا کرتی ہیں۔"

(انتقادیات: ص86)

"میرے نزدیک شاعری کے تمام اصناف میں "غزل گوئی" جس قدر و بلند چیز ہے اور کوئی نہیں۔

روح کی گہرائیوں اور قلب کی اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے۔"

(مذاکرات نیاز: نگار مارچ 1986ء ص 32)

"غزل کی زبان کبھی پہلے نہیں بنتی بلکہ غزل گو کے خیالات کی ساتھ پیدا ہوتی ہے وہ زبان کی پابند نہیں بلکہ خود زبان اس کی محتاج ہے۔"

(مذاکرات نیاز: نگار مارچ 1986ء ص 36)

نیاز فتح پوری کے مختلف مضامین اور تحریروں سے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان سے ان کے نظریات شعری کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

1- شعر کے معنی الفاظ سے ادا ہونے چاہئیں۔

2- شاعر کا فطری ہونا ضروری ہے۔

3- شاعری کے لئے تاثرات کی بڑی اہمیت ہے اور اس میں ترنم کو قائم رکھا جائے۔

4- تاثرات کو محسوسات کے حوالے سے بیان کرنا شاعری ہے اور یہی ذوق سلیم بھی ہے۔

5- شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو ضروری چیزیں ہیں۔

6- شعر میں خیال کی پاکیزگی اسے دوشاخہ بلکہ سہ شاخہ بنادتی ہے۔

7- خیال کو الفاظ کے ذریعے ادا کرنا فن ہے۔

8- شاعری کی اصل روح الفاظ کا رکھ رکھاؤ ہے۔

9- شاعری وجدانی تسکین کا ذریعہ ہے۔

10- غزل کا تعلق صرف انسانی جذبات سے ہے۔

11- غزل ہجر و فراق کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔

12- روح کی گہرائی اور قلبی کیفیات کا اظہار صرف غزل کے وسیلے سے ہوتا ہے۔

13- زبان غزل کی محتاج ہے جو خیال کے ساتھ بنتی چلی جاتی ہے۔

14- شاعری کا خون تصوف کے ہاتھوں مجھے پسند نہیں۔

ان مخصوص شعری نظریات اور تصورات کے تناظر میں جب ہم مصحفی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تصوف کے ہاتھوں مصحفی نے شاعری کا خون نہیں کیا اور اسی دنیا کی اور اس کے معاملات و معمولات کی شاعری کی ہے جس کی نیاز فتح پوری کی نزدیک

اہمیت بنتی ہے اور پھر اس نے گوشت پوست کے چلتے پھرتے سانس لیتے، ہنستے ہنساتے، روتے رلاتے، چھپتے چھپاتے اور کبھی کبھار سامنے آ جانے والے انسان سے عشق و محبت کا کھیل کھیلا ہے۔ دنیاوی محبوب اور دنیاوی حسن کی گیت گائے ہیں۔ حسن یار کی رنگینیوں اور رعنائی کی بات کی ہے۔ اس کے کوچے میں دن کو رات کہا ہے اس کے ہجر و فراق میں پلکوں پر ستارے چمکائے ہیں اور غزل کو غزل کے ہر روپ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب کے بیان میں جس سادگی مگر پرکاری اور صنعت گری کا عملی اظہار مصحفی کے ہاں ہوا ہے وہ اس کے ہم عصر دوسرے شعراء کے ہاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہی کہ اس نے میر جیسے خود پرست شاعر سے بھی داد لی ہے اس کا تذکرہ آزاد کی زبانی سنئے لکھتے ہیں "ایک مشاعرے میں میر تقی میر موجود تھے، شیخ مصحفی نے غزل پڑھی:

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا:

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لی گئی دل کو

تو میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا۔ اس کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا۔ شیخ موصوف اس قدر الفاظ کو فرمان ۔۔۔۔ تمغا اپنے کمال کا سمجھے بلکہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ سلام کئے او۔ کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا۔" (آب حیات: ص 257)

عجیب بات یہ ہے کہ صاحب آب حیات نے مصحفی کے مقابلے میں انشاء کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ نیاز فتح پوری اس سے متفق نہیں، لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کی شاعری ہمیشہ ان کی زیر بار احسان رہے گی کیونکہ جتنے نامور شاعر وہاں پیدا ہوئے وہ سب مصحفی کے شاگرد تھے یا ان کی شاگردوں کے شاگرد تھے۔ ناسخ انہیں اسے مستفید ہوئے، آتش نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ متاثرین میں اسیر ان کے شاگرد تھے اور انیس و دبیر جن کی زبان دانی کو دنیا نے تسلیم کیا انہیں کے ارادت مند تھے۔ آزاد انشاء کا ذکر مصحفی کے مقابلے میں بہت بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں حالانکہ جس حد تک شاعری کا تعلق ہے انشاء کو کوئی نسبت نہ تھی:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

جب اس نے اٹھائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی
تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

(انتقادیات: ص47-46)

مصحفی کے ایسے اشعار میں تغزل کی جو چاشنی ہے، زبان وبیان کی جو لطافت اور الفاظ کی جو نزاکت ہے اور پھر لب ولہجے میں نرمی، کومل پن اور حلاوت ہے وہ نیاز فتح پوری کے لئے مصحفی کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کا سبب بنی اور اسی وجہ سے وہ مصحفی کو سودا پر ترجیح دیتے ہیں:

" مصحفی اپنی ہمہ گیر طبعیت کے لحاظ سے بالکل سودا تھے اور کسی مصنف سخن میں عاری نہ تھے لیکن اگر محض تغزل کو سامنے رکھا جائے تو وہ یقیناً سودا سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔"

(انتقادیات: ص46)

"اگر محض تغزل کو سامنے رکھا جائے تو وہ یقیناً سود سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔"

(انتقادیات: ص48)

" مصحفی اپنے پر گوئی کے لحاظ سے سودا سے کسی طرح کم نہ تھے اور مشکل زمینوں میں ایسے ایسے صاف شعر نکالتے تھے کہ جواب نہیں۔"

(انتقادیات: ص114)

" مصحفی اپنی ہمہ گیر طبعیت کے لحاظ سے دوسرے سودا تھے لیکن تغزل میں وہ سودا سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مشکل زمینوں میں بغیر کسی تکلف کے بہترین اشعار نکالنا ان کی خصوصیت خاصہ تھی۔"

(نگار اصناف سخن نمبر: ص9 جنوری فروری 1957ء)

ان آراء نے یہ واضع کر دیا ہے کہ نیاز فتح پوری مصحفی کی پر گوئی اور اس کے تغزل کے بے حد قائل تھے۔ مصحفی کی غزل میں درد کو جو سلگاؤ اور حسن وعشق کا جو رچاؤ ہے وہ قاری کو ایک عجیب لذت اور فرحت سے ہم

کنار کرتا ہے اور اس کی جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سبب بھی بنتا ہی اور یہی چیز نیاز فتح پوری کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہے۔ جہاں تک مصحفی کی شاعری کا تعلق ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دوسرے ہمصر شعراء سے ممتاز اور منفرد کرتی ہے وہ اس کی مشاہدات ومحسوسات کا کمال ہے۔ اس نے جس طرح اپنے محبوب کا پیکر تراشا ہے اور اس میں جو رنگ بھرے ہیں یا جن رنگوں کی کیفیات کو الفاظ کے حوالے سے محاکاتی شکل دی ہے وہ جاذب نظر بھی ہے اور تسکین دل وجاں بھی اور اس سے بدن میں ایک فرحت آگیں لہر سنسنانی لگتی ہے۔ اس حوالے سے بدن، زلف اور آنکھوں کا بیان مصحفی کے کمال فن کا غماز ہے اور حیاتی پیکر تراشی کا یہ فن صرف مصحفی کو ہی آتا ہے:

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منہ پر تیرے مینہ کی بوندیں
جون لالہ تر حسن ترا اور بھی چمکا

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کی جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہہ میں
سرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہہ میں

کون آیا ہے نہانے لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کی اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سہ سمن کی اندر

گورے بدن کا عالم اس کے میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

اس سبب تو پریشاں رہا میں دنیا میں

کہ سانس تیری زلفوں کی بتری دیکھی

بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنی مکھڑے پر

تو مارے شرم کی آتی ہوئی گھٹا پھر جائے

سرمہ دینے میں اس کی آنکھوں میں

کیا کہوں آبدارریاں کیا تھیں

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کف پا کا لے لوں

رنگ ہونٹوں پہ ترے تازہ حنا کا لے لوں

جمنا میں کل نہا کر اس نے جو بال باندھے

ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

ان اشعار کی تشریح اور ان کے معانی بیان کرنا مصحفی کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے اس لئے کہ یہ ساری چیزیں جس جمالیات سے تعلق رکھتی ہیں اور محسوسات کی دنیا سے متعلق ہیں اور پھر آنکھوں کو بند کر لینے کے بعد تصور جاناں میں کھو جانے کے عمل سے عبارت ہیں۔ گویا بدن، آنکھوں کو بند کر لینے کے بعد تصور جاناں میں کھو جانے کے عمل سے عبارت ہیں۔ گویا بدن، آنکھوں، زلفوں اور پاؤں کے رنگ مصحفی نے جمائے ہیں اس مصحفی کا رنگ ہی کہا جا سکتا ہے اور اس میں جو تپش اور جلوہ گری ہے وہ دیکھی بھی جا سکتی ہے اور محسوس بھی کی جا سکتی ہے۔ تغزل کا جو رچاؤ اور رسیلا پن مصحفی نے پیدا کیا ہے اسے فراق گورکھپوری نے میٹھے دور سے تعبیر کیا ہے۔ مصحفی کے اسلوب بیان کے بارے میں نیاز فتح پوری کی اس رائے سے مکمل اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر رنگ کے مقلد تھے اور خود ان کا طبعی رنگ کوئی نہیں تھا، بالکل غلط ہے یہ الگ بات کہ وہ میر، سودا اور جرات کے درمیان پھنس گئے تھے اور پھر داخلیت اور خارجیت کے چکر میں بھی الجھے تھے تاہم انہوں نے اپنی تخلیقی فعالیت اور ریاضت سے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی اور اپنا ایک انفرادی رنگ بھی پیدا کیا اور جس کی تقلید اس کی شاگردوں اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری نے امیر مینائی کا تذکرہ کرتے ہوئے چند شعروں کی مثال دی ہے:

اک ذرا پردہ محمل کو اٹھا دے لیلیٰ

پھر کوئی حالت بی تابی مجنوں دیکھے

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل

اور بو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر

کچھ تمہارا غریب لیتا ہے

"کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ یہ اشعار کسی لکھنوی شاعر کے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ تصرف ہے ان کی استاد مصحفی کا جو غیر لکھنوی تھے۔"

(انتقادیات: ص 42-41)

"اسی طرح فراق گورکھپوری کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ:

"اگر ہم اس وقت یہ معلوم کرنا چاہیں کہ فراق کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ان کا میلان وہ ہے جو مصحفی کا تھا۔"

(انتقادیات: ص 300)

نیاز فتح پوری نے الفاظ کے جس رکھ رکھاؤ اور پھر لفظ کے خیال کا ساتھ دینے کا زکر کیا ہے مصحفی کے ہاں ہو بہو وہی سلیقہ اور وہی قرینہ نظر آتا ہے جو ایک بڑے اور انفرادیت رکھنے والے شاعر میں ہو سکتا ہے یا پھر ہوتا ہے۔ مصحفی نے تیغ، دل، تلوار، زخم، داغ، چمن، خواب، خیال، ہجر، وصال، آئینہ، مہتاب، بزم، شمع، عشق، آنکھ، پاؤں، زلف، آنسو، تنہائی، شب، قیامت، گل، قسمت، آشنا، وطن، مسافر اور بدن جیسے جتنے بھی لفظ استعمال کئے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے مقام پر بڑی بھر پور معنویت کی ساتھ آئے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کے ہاں اگرچہ ترکیب سازی کا رجحان نہیں ملتا تاہم انہوں نے جو ترکیبیں بھی برتی ہیں ان میں بھی ایک طرح کی ہنرمندی ضرور دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ وقت دگر، خوگر جفا، کلف دل، دامن صحرا، چشم شوق، سرو رواں، عمر رواں، شب ہجراں، زخم دل فگار، رنگ حنا، کف پا، شکست رنگ، مرغ بے پر، آوارگان شوق، بے قراری بسمل، آسودگی خاک، سرمہ تسخیر، شاخ گل، قفس مرغ اور ۔۔۔۔ نازک۔ شعر کی جمالیاتی کیفیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ مثلاً

جس بیابان خطرناک میں اپنا ہے گزر

مصحفی قافلے اس راہ میں کم نکلے ہیں

پاؤں کو لگا مہندی دل خون کیا میرا

کیا جانیے کیا آفت تا وقت خرام آوے
اک شاخ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ
قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی
یاد ایام بے قراری دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

حقیقت یہ ہے کہ مصحفی نے اپنے زمانے میں بے پناہ شاعری کی اور ڈٹ کر کی۔ کوئی زمین، کوئی قافیہ، کوئی ردیف، کوئی خیال، کوئی موضوع اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو ان کی تصرف میں نہ آیا ہو۔ آٹھ دیوان چھوڑ کر جانے والا شاعر ہی ایسا کر سکتا ہے اور شاید اسی لئے نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

" مصحفی اپنے فن کا امام تھا اور غزل گوئی میں ایسے ایسے پاکیزہ بیان اسلوب پیدا کر گیا کہ اس سے قبل کسی شاعر کو اس حیثیت سے مصحفی کی مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

(انتقادیات: ص115)

اور یہ سچ بھی ہے کہ مصحفی اپنے فن کا امام تھا اس لئے کہ جدید شاعروں نے اس کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور یوں ناصر کاظمی، انجم رومانی، سجاد باقر رضوی اور پروین شاکر کے علاوہ کئی شاعروں نے اس کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں، مصحفی نے کیا خوب کہا ہے:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اور لمحہ موجود میں دل کے زخموں کی رفوگری کا کام جاری ہے!

ادب کے متضاد نظریات کے حامل دو کردار

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

(ولادت: ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء، وفات: ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء)

اور

جوش ملیح آبادی

(ولادت: ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء، وفات: ۲۲ فروری ۱۹۸۴ء)

''اب کون ہے جو شعر کی حقیقت اور ماہیت اور اس کی معنوی خوبیوں کو سمجھائے گا۔ کون ہے جو اُردو کی تصویر کو تہذیب کے بڑے مرقعے میں سجائے گا۔ کون ہے جو اچھی کتاب کے لکھنے یا چھپنے پر اتنا خوش ہوگا۔ یہ وسعتِ معلومات، یہ بالغ نظری، یہ سخن فہمی یہ متانتِ علم، یہ نفاستِ ذوق، یہ وضع داری، یہ وقار، علم کا شوق، یہ نکتہ رسی، لکھنؤ سے یہ عشق، یہ کرید، یہ جستجو، زبان و ادب کی ادا شناسی اب کہاں ملے گی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے اٹھ جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرد نہیں پورا ایک عہد ختم ہوگیا۔ ایک تہذیب سوگوار ہوگئی۔ ایک شہر بے رونق ہوگیا۔ ایک انجمن سونی ہوگئی۔''

(خواجہ فاروقی)[1]

''شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے ایک نہایت غیر انقلابی حرکت

کی، یعنی انتقال کر گئے۔ حالاں کہ ہندوستان اور پاکستان میں عام خیال یہ تھا کہ موجودہ دور کے شاعروں میں اگر کوئی سو برس جیے گا تو وہ جوشؔ صاحب ہی ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ تھی اس لیے کہ ان کی شاعری اور ان کی ذات میں اتنا جوش جوانی اور تازگی تھی کہ لگتا تھا کہ وہ اپنا برا چاہنے والوں کو مار کے مریں گے مگر وہ تو اسّی (ایک روایت میں ستاسی برس) میں سدھار گئے۔ ان لوگوں کے لیے جو ان کی جوانی کی (اس بڑھاپے میں بھی) قسمیں کھاتے تھے۔ خود جوشؔ نے ایک بار دعا مانگی تھی۔

معشوق کہے آپ ہمارے ہیں بزرگ
وہ دن ہمیں یا رب نہ دکھانا ہرگز

(خواجہ احمد عباس)[۲]

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور جوشؔ ملیح آبادی دونوں لحۂ موجود میں بھی اپنے عہد کی نابغہ روزگار شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک تحقیق و تنقید کے شہوار تھے تو دوسرے شعر و ادب کے درخشندہ آفتاب ...... ایک نے معیار نقد کو اعتبار بخشا تو دوسرے نے شعر و نغمہ کو تمکنت عطا کی۔ ایک نے دھیمے اور متوازن انداز میں تحقیق کی گتھیاں سلجھائیں تو دوسرے نے دبنگ اور بلند آہنگ طریق سے اسلوب نظم کو مروج کیا۔ ایک نے غزل کی طرف داری کی تو دوسرے نے نظم کی پاس داری کی ...... ایک نے غزل کا دفاع کیا تو دوسرے نے غزل کو رد کیا۔ یوں یہ دونوں صاحبان علم و فن کی ندی کے مشرقی اور مغربی کناروں پر سرگرم سفر رہے۔

مسعود اور جوشؔ ۱۹۱۰ء میں حسین آباد ہائی سکول لکھنؤ میں آٹھویں درجے کے طالب علم تھے۔ مسعود حسن رضوی بتاتے ہیں کہ اس ہم جماعتی کے زمانے میں ہم دونوں

میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی اس لیے کہ جوش سب سے پیچھے کی نشست پر دوسروں سے بالکل الگ تھلگ بیٹھتے تھے۔ جوش کچھ دن تک سکول آتے رہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ مسعود صاحب نے جوش کی پہلی غزل کینگ کالج لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرے میں سنی تھی۔

سید مسعود حسن رضوی اپنی ایک نامکمل یادداشت (لکھنؤ کے مشاعرے) میں رقم طراز ہیں۔ ''کینگ کالج کے سالانہ مشاعرے کے داعی انگریزی ادب کے استاد جناب رف۔ لی۔ رائے صاحب ہوا کرتے تھے میں اس کالج میں بی۔ اے کا طالب علم تھا ایک مشاعرے میں طرح تھی۔ ''آج تک ہم ہیں فریبِ آہِ بے تاثیر میں''۔ جواں سال اور جواں طبیعت جوش ملیح آبادی نے بڑے زوردار لہجے میں غزل پڑھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا۔

کیسی آزادی کی طالب ہیں یہ فانی ہستیاں
روح تو جکڑی ہوئی ہے زیست کی زنجیر میں[۳]

مسعود حسن رضوی جب لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی و اُردو میں لیکچرر ہوئے تو جوش ملیح آبادی سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا اور جوش صاحب پاکستان ہجرت کرنے سے پہلے تک مسعود صاحب سے ملتے رہے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں مکالمے ہوتے رہے غزل پر بھی بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا۔ اس تناظر میں ان کا ایک ابدی تعلق برقرار رہا۔ جیسا کہ آپ سب اہلِ علم کے علم میں ہے کہ مسعود حسن رضوی غزل کے حامی اور جوش منکرین غزل میں سے تھے اس لیے ان دونوں کے غزل پر کئی بار مباحثے ہوئے۔ ایک دفعہ رات کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے مشاعرے میں جوش شریک تھے مسعود حسن رضوی بھی تھے وہاں دونوں میں غزل پر کچھ گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن ریڈیو والوں نے جو عصرانہ دیا اس میں دونوں پاس پاس بیٹھے تھے۔ جوش نے کہا مسعود صاحب آپ غزل کی حمایت میں کچھ لکھیے۔ میں بھی اپنے قوائے جملہ کو بالکل تیار کئے بیٹھا ہوں۔ مسعود صاحب نے کہا جوش صاحب ہمارے آپ کے بیچ کئی بار بحث ہوئی۔ لیکن آپ قائل ہو ہو کر منکر ہو جاتے ہیں۔

اچھا اب یہ کیا جائے۔ کہ ہائی کورٹ کے کسی جج کو قاضی بنایا جائے۔ زیر بحث مقدمے کی تنقیحات لکھ کر قائم کی جائیں اور ایک ایک تنقیح پر ہم بحث کریں تمام تنقیحات پر بحث کی سماعت کے بعد جج جو فیصلہ کرے وہ ہم دونوں قبول کر لیں۔ جوشؔ بھی اس پر راضی ہو گئے۔ لیکن یہ مقدمہ پیش نہ ہوا۔

ایک بار مسعود صاحب کے یونیورسٹی جانے کا وقت قریب تھا کہ جوشؔ آ پہنچے۔ دو چار باتوں کے بعد کہنے لگے کہ آج میں آپ سے اس موضوع پر بحث کرنے آیا ہوں کہ اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے مسعود صاحب نے کہا کہ اب تو میرے یونیورسٹی جانے کا وقت آ گیا ہے اور یہ بحث یقیناً طویل ہو گی۔ لہذا پھر کبھی سہی! جوشؔ صاحب بولے کہ اچھا تو مختصراً میں اپنی رائے ظاہر ہی کر دوں کہ میرے نزدیک اُردو کا سب سے بڑا شاعر نظیرؔ اکبر آبادی ہے۔ مسعود صاحب نے کہا کہ مختصر طور پر میں اس رائے سے اپنا اختلاف ظاہر کرتا ہوں۔ پھر کہا کہ نظیرؔ سے بڑا شاعر تو میں آپ کو ہی سمجھتا ہوں۔

مرزا جعفر حسین وکیل (جوشؔ کے ہم مشرب دوست) کے ہاں ایک ادبی نشست میں جوشؔ اپنی زیرِ تکمیل نظم ''حرفِ آخر'' کا ابتدائی حصہ سنا رہے تھے مسعود صاحب نے کئی مقامات پر بڑی تعریف کی لیکن ہر بار یہ ضرور کہا واہ کیا تغزل ہے۔ جوشؔ صاحب اس تعریف پر ہر بار ان کو گھور کر دیکھتے تھے آخر ایک بار ضبط نہ کر سکے اور بول اٹھے صاحب! یہ تغزل کیا تنظم کہیے تنظم!

مسعود صاحب نے کہا بھئی ہماری لغت میں تنظم کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اس نظم میں حوا کو پہلی بار دیکھنے پر آدم کے دل میں جو لطیف جذبات پیدا ہوئے ہیں ان کی جس خوب صورتی سے آپ نے تصویر کھینچی ہے اس کو تو تغزل کہتے ہیں۔ سب اہلِ محفل نے تائید کی کہ بے شک یہاں زبردست تغزل موجود ہے۔

مسعود اور جوشؔ کے غزل کے بارے میں جو ادبی اختلافات ظاہر ہوئے ہیں وہ ان کی تحریروں سے بھی عیاں ہے۔ غزل کے محدود عشقیہ مضامین کے بارے میں اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے۔

''غزل حقیقت میں جذبات کا مرقع ہے۔ اس کا ہر شعر کسی انسانی جذبے کی تصویر ہے اور انسان کے جذبے اپنی نیرنگیوں میں شمار کی حد سے نکل جاتے ہیں اس لیے بے شمار مضامین غزل کے شعروں میں موجود ہیں مگر انہیں سمجھنے کے لیے شاعر کی زبان سمجھنا ضروری ہے۔''[۴]

دوسری جانب جوش ملیح آبادی نے اپنے مضمون ''تنگنائے غزل'' میں یوں اظہار کیا ہے اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری اپنے زمانے کی موزوں اور شیریں تاریخ اور عری شخصیت کا ایک کھلکتا ہوا افسانہ اور خود نوشت حیات نامہ ہوتی ہے تو اس قول کی روشنی میں جب ہم اپنے دواوین کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک زبردست شرمندگی اور ایک عظیم مایوسی ہمارا احاطہ کر لیتی ہے اور ہمیں یہ جرات نہیں ہوتی ہے کہ ہم دنیا کی عظیم شاعری اور دنیا کے عظیم شاعروں کے روبرو اپنی غزل کی اوچھی پونجی پیش کریں جو خوردہ اندیشی اور خوردہ فروشی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔''[۵]

مسعود حسن رضوی کی رائے جوش ملیح کی رائے سے قطعی طور پر مختلف ہے وہ اپنے ایک مضمون ''صنفِ غزل پر ایک تحقیقی نظر'' میں رقمطراز ہیں ''میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں مگر نہ غزل گووں پر ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور متشاعر میں امتیاز نہ کرسکوں نہ غزل کا ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہوسکوں۔ اُردو شاعری میں جو نئے نئے تجربے کئے جارہے ہیں ان میں بعض چیزوں کو انفرادی طور پر غلط یا مضر سمجھنے کے باوجود مجموعی طور سے ان کو اُردو شاعری کی حیات کے اثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا ہوں مگر ہمارے وہ شاعر جو قدیم اصناف سخن میں دادِ سخنوری دے چکے ہیں اور کمال شاعری صرف کر چکے ہیں ان کے کارناموں کو غلط فہمی کی بدولت مٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور شاعری کا جو سرمایہ ہماری زبان نے دو تین صدیوں کی طویل مدت میں جمع کیا ہے اس کو سخن فہمی کے ہاتھوں لٹتے نہیں دیکھ سکتا۔''[۶]

جس طرح مسعود حسن رضوی تخیل اور الفاظ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور شعر کی لفظی خوبیوں میں سادگی، اختصار، زور اور مناسبتِ الفاظ اور جدت کو لازمی خیال کرتے ہیں اسی طرح جوش ملیح آبادی بھی ان سے متفق (مگر کسی حد تک) نظر آتے ہیں۔ الفاظ کی اہمیت کا اظہار انہوں نے اپنے ایک مضمون ''الفاظ و شاعر'' میں تفصیل سے کیا ہے ان کے بقول ''الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو وہ تو بے جان لکیریں ہیں نہ ہوا کی گرہیں۔ الفاظ تو ذی حیات ہیں انسانوں کی روحِ ذی حیات......''[4]

اس بات کی تصدیق ان کی نظم لافانی حروف سے اس طرح ہوتی ہے۔

کون آئے ذہن کے تاج وعَلَم کے سامنے
کانپتی ہے تیغ چنگیزی قلم کے سامنے
اول اول آندھیوں میں سنسناتا ہے قلم
پھر انہیں اپنے چراغوں پر نچاتا ہے قلم
کشورِ وقتِ جہاں کو فتح کرتے ہیں حروف
قبر میں شاعر اترتا ہے ابھرتے ہیں حروف
ناز کر اے دل کہ آہ دار غنوں کے درمیاں
لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں[5]

بات لفظ و معنی اور حروف کے حوالے سے غزل کی ہو رہی تھی تو ایک بار پھر پردہ اٹھتا ہے تو منظر یہ ہے کہ مسعود حسن رضوی کے مکان ادبستان کے ڈرائنگ روم میں غزل پر بحث شروع ہے۔ جوش نے کہا کہ ''دو مصرعوں میں کوئی نفسیاتی تجربہ تکمیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مسعود نے کہا جوش صاحب یہاں پر ''سکتا'' کا لفظ آپ نے بہت غلط استعمال کیا ہے۔ جو عمل بار ہا ہو چکا ہو اس کے امکان پر غور کرنا چہ معنی دارد...... غزل کے بے شمار شعر ایسے ہیں جن میں شاعر نے اپنے کوئی نہ کوئی نفسیاتی تجربہ تکمیل کے ساتھ بیان

کیا ہے دیکھئے عہدِ شباب کے متعلق ایک شاعر اپنا نفسیاتی تجربہ بیان کرتا ہے ذرا بتایئے کہ یہ بیان نامکمل تو نہیں ہے۔

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے پہ تھا نکھار
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

شباب کے متعلق ایک اور شعر سنیئے:

آج ہم روئے بہت دیکھ تصویر شباب
یاد پھر آگئی بھولے ہوئے افسانے کی

اور اب خود اپنے ایک نفسیاتی تجربے کو دیکھئے کہ ایک غزل گو شاعر نے وہی تجربہ بیان کیا ہے۔ آپ کی ایک نظم ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے سب لوگ مجھ کو چاہتے تھے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے لیکن اب سب میرے مخالف ہو گئے ہیں جہاں تک غور کرتا ہوں اس تبدیلی کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اب میرا شعور پختہ ہوگیا ہے'' اس کے بعد وہ نظم مجھے یاد نہیں ...... غزل کا شعر ہوتا تو یاد ہو جاتا۔ بہر حال آپ کی ایک نظم کا یہی مفہوم ہے نا!

جی ہاں! جی ہاں!

اب میں غزل کا شعر پڑھنے جارہا ہوں اسے سنئے کہ اس میں یہی تجربہ بیان ہوا ہے اور آپ کی پوری نظم سے زیادہ تکمیل کے ساتھ!

یہ کیوں کر ہو سکتا ہے ...... پھر وہی ہو سکتا ...... جناب یہ ہو چکا ہے ...... اچھا ارشاد! اور خیال رہے کہ یہ آپ کا ذاتی تجربہ ہے لہذا اس کے تکمیل کے ساتھ بیان ہونے کے متعلق آپ سے بہتر کون فیصلہ کر سکتا ہے۔ ...... یقیناً! سنایئے صاحب! وہ کونسا شعر ہے۔

اور یہ بھی دیکھئے گا کہ اس شعر میں صرف نفسیاتی تجربہ ہی بیان نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ ذاتی تاثر کی جھالر بھی لگی ہوئی ہے۔

ارے صاحب وہ شعر سنایئے تو!

اور یہ تاثر الگ سے نہیں ٹانکا گیا ہے بلکہ شعر میں سمویا ہوا ہے۔

افوہ! آپ تو اشتیاق بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ صاحب وہ شعر!

اور واضح ہو ہے کہ یہ غزل کا شعر ہے کسی نظم کا نہیں۔

ایک غزل گو شاعر......

مسعود صاحب کسی طرح سنا چکئے

بہتر ہے ملاحظہ ہو:

باولے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی

جوش نے جھوم جھوم گئے چار پانچ مرتبہ شعر کو پڑھوایا پھر پوچھا کس کا شعر ہے۔

کسی شاعر کا نہیں...... کہنے والا ایک غزل گو ہے۔

کون؟

وہی بڈھا میر جسے آپ شاعر نہیں مانتے...... ایک بار پردہ گرتا ہے اور پھر پردہ اٹھتا ہے تو مرحوم سید اعظم حسین (شاعر شمیم کرہانی کے بڑے بھائی) سے جوش صاحب کہنے لگے کہ مسعود صاحب آدمی بہت ذہین اور قابل ہیں لیکن وہ بھی غزل کے حامی ہیں پھر مجھی کو غزل کیوں ناپسند ہے......

مسعود حسن رضوی خود بھی جوش کی ذہانت کے قائل تھے اپنی یادداشتوں میں انہوں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ریل کے سفر میں ان کا اور جوش کا ساتھ ہو گیا شام ہوئی تو جوش صاحب نے شراب کے لوازم نکالے اور مسعود صاحب کو بھی شراب نوشی میں شرکت کی دعوت دی۔ مسعود صاحب نے انکار کر دیا اور جوش اکیلے پیتے رہے اس کے بعد کہنے لگے شراب پینا گناہ ہے لیکن میں اس گناہ کا ارتکاب کر چکا ہوں اس لیے اب مجھ میں صلاحیتِ گناہ باقی نہیں رہی۔ آپ اس گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے لہذا آپ میں صلاحیتِ گناہ باقی ہے اب آپ صلاحیتِ گناہ کے ساتھ سوئیے گا میں اس کے بغیر سوؤں گا۔ [9]

مسعود حسن رضوی اور جوش ملیح آبادی میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہا ڈاکٹر نیر مسعود نے مسعود حسن رضوی ادیب کے نام خطوط کا جو مجموعہ مرتب کیا ہے اس میں جوش ملیح آبادی کے پانچ خط بھی شامل ہیں جو درج ذیل ہیں:

مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۳۵ء

دھول پور

مکرمی!

کاخ بلند کے نام سے، جیسا کہ رسائل و اخبارات سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا میں دہلی سے ایک معیاری ماہنامہ جاری کرنا چاہتا ہوں۔ مفلس و محکوم ہندوستان میں طبقہ اعلیٰ کے ادیب اور شاعر اس قدر کم ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جن میں ایک آپ کی ذاتِ گرامی بھی ہے اور اسی بنا پر آپ کو ان چند سطور کے مطالعہ فرمانے کی زحمت دی جا رہی ہے۔ امید کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

مجھ سے زیادہ آپ کو اس کا علم ہوگا کہ ہندوستانی زبان، ہندوستانی تہذیب و تمدن ہندوستانی ذہنیت، یا یوں کہیے کہ ہندوستانی روح کو اس وقت رہ نمائی اور زبردست انقلاب کی اتنی شدید ضرورت لاحق ہے کہ ملک کے ہر حساس صاحب قلم پر فرض ہو چکا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک معقول حصہ رسائل و اخبارات کے لیے وقف کر کے قوم کی ذہنی تربیت اور رائے عامہ کی اثر آفرینی کا فریضہ ادا کرے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک کسی قوم میں بیداری و زندگی پیدا نہیں ہوئی ہے جب تک اس کے ادبیات میں عظیم انقلاب پیدا نہیں کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ انقلاب کہیں باہر سے نہیں آتا، اس ملک کے مشاہیر اسے پیدا کرتے ہیں۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجیے کہ آپ کے مستقل و متصل تعاون کے بغیر رسالہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ نے اعتنا نہ فرمایا تو میری انتہائی بدبختی ہوگی کہ جس جماعت کے بھروسے پر میں یہ اہم ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہوں۔ اور جس طبقے کی ترجمانی کی خاطر میں اپنی باقی زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں وہی میرا ساتھ نہ

دے۔

آخر میں نہایت خلوص کے ساتھ آپ کی جناب میں استدعا کی جاتی ہے کہ سرِ دست ''ڈمی''، یعنی نمونے کے پرچے کے واسطے جو وسط ستمبر تک شائع ہوگا، آپ ازراہ معارف نوازی اپنا گراں قدر مضمون ایک ہفتے کے اندر مرحمت فرما کر جذبہ شکر گزاری کے ساتھ ساتھ مجھے اس طمانیت بخش احساس سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجئے کہ میری قوم کے ارباب جوہر مجھ سے تعاون پر تیار ہیں۔ دوسری درخواست یہ ہے کہ مندرجہ ذیل ابواب میں سے دو ایک باب اپنے واسطے مختص فرما کر ہر ماہ ایک مقالہ مرحمت فرماتے رہیں۔

یہ عرض کر دینا بھی مناسب خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کروڑوں افراد میں سے صرف چند مخصوص حضرات کی خدمت میں یہ تحریر روانہ کی جا رہی ہے۔ اگر اس طبقہ نے مجھے مایوس کر دیا تو میں یہ فیصلہ کر کے ہندوستان ہنوز ایسے سنجیدہ منصوبوں کے واسطے تیار نہیں ہے، اجرائے رسالے کا خیال ہی ترک کر دوں گا۔ اس تحریر کے مطالعہ کا شکریہ۔

(فہرست ابواب پشت پر)

نیاز مند

جوش ملیح آبادی

ے افگند نم زِ نظم کاخ بلند

کہ از باد و باراں نیابد گزند

(فردوسی)

ابواب کاخِ بلند

ابواب	تشریح ابواب
(۱) اشارات	حیات انسانی کے گوناگوں مسئلوں، اور ہندوستانی زندگی کے مختلف

پہلوؤں، نیز مشرقی ومغربی مباحثِ علم وادب پر مختصر نوٹ۔

(۲) افکار حکیمانہ و محققانہ مضامین جو کامل حریت فکر کا درس دیں، اور روایت واوہام، تقلید وجمود، محکومی وافلاس، اور تعصبات وتنگ نظری کے خلاف مسلسل جہاد کریں۔ تعلیم یہ دی جائے کہ انسانیت نسل رنگ، معاشرت، رسوم، لباس زبان وطن اور مذہب سب سے بالاتر ہے۔

(۳) منتخبات ادبی وعمرانی نقطہ نگاہ سے غیر زبانوں اور دورِ جدید کے بلند پایہ رسائل کے تراجم۔

(۴) ادبیات ادبی مضامین، نظمیں، افسانے اور ڈرامہ، صحیح تربیت اور حقیقی شعریت کا معیار ہوں۔ نیز صرف وہ غزلیں جو فطری اور مسلسل ہوں۔

(۵) مقالات عام علمی، اقتصادی، زرعی اور صنعتی مضامین اور ان کے دوش بدوش ایسے مقالے جو اہلِ ہند کو زندگی و بیداری، خود شناسی اور رواداری، آزادی و قربانی، نیز دماغی توازن، جسمانی صحت مردانہ سیرت۔ معاشری اصلاح اور سیاسی تدبر و تفکر کا مستقل درس دیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی خصوصیت کے ساتھ ایسی زبردست اور مسلسل تبلیغ کریں کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کی ایسی مضبوط بنیاد پڑ جائے کہ باہمی ازدواج ہونے لگے۔

(۶) لسانیات زبان میں اصلاح وارتقا اجتہاد و وضع اصطلاحات تہذیب و تدوین قواعد ولغت، اور تصفیہ مسائل ادبی ولسانی۔ نیز ایک ایسی سرگرم انجمن کی تشکیل جو ہندوستان میں ایک مشترکہ زبان کی بنیاد ڈال دے۔

(۷) نسائیات ایسے مقالے جو میانہ روی پر مبنی ہوں لیکن قدامت پرستی اور شدید پردے کی سخت مخالفت کے ساتھ اور عورتوں کے جائز حقوق ومطالبات کی حمایت ہیں۔

(۸) انتقادات ذاتیات سے قطعی طور پر مبرا جدید نظریاتِ نقد ونظر کی روشنی میں غیر طنز آمیز سنجیدہ ترین لہجے کے ساتھ کلیتہً علمی وادبی اسلوب ہو۔

(۹) حیات ونشاط خوش باش دمے کہ زندگانی این است۔ محکومی ومفلسی نے وطن عزیز

میں جو ایک عام افسردہ دلی اور ناروا سنجیدگی پیدا کر رکھی ہے یہ باب اس کی بیخ کنی کی خاطر قائم کیا گیا ہے۔ واضح رہے۔ کہ جو مسکرا نہیں سکتا وہ...... رہے۔

(۱۰) رفتار وقت عصر حاضر کے اہم کوائف اوران پر مختصر پُر مغز تبصرے۔

(۱) مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۵ء

دھول پور

برادر مخلص

مضمون پہنچا، دلی شکریہ قبول فرمائیں، میں آپ کے مشوروں پر انشاء اللہ ضرور عمل کروں گا۔ پرچے کے نام کے متعلق بھی غور کر رہا ہوں۔

براہِ کرم دوسرے نمبر کے لیے اگر کوئی حکیمانہ مقالہ، یا ہندو مسلم اتحاد پر کوئی مضمون تحریر فرمائیں تو مناسب ہے۔

مجھے آپ کی اخوت سے یقین ہے کہ آپ اپنے گراں قدر مضمون سے رسالے کے کسی نمبر کو بھی محروم نہ رکھیں گے۔ آپ کی عنایت کا مکرر شکریہ۔

نیاز مند

جوشؔ

(۲) مورخہ نومبر ۱۹۳۵ء

کلیم۔ دہلی

شفیق محترم!

مدیر جوشؔ ملیح آبادی

آپ کا گراں قدر مقالہ اس مہینے میں شائع ہو رہا تھا، مگر بد قسمتی سے عین وقت پر اس کی کاپی خراب ہو گئی، اس لیے اب مجبوراً نومبر میں شائع ہو گا۔ یہ اس لیے لکھ دیا کہ آپ کہیں دوسری جگہ مضمون نہ بھیج دیں۔

نیاز مند

جوشؔ

(۳) مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۶ء

کلیم - دہلی۔

مدیر جوشؔ ملیح آبادی

افسوس کہ آپ نے اب تک ''کلیم'' کو کوئی مضمون نہ بھیجا یہ ہے یگانوں کا سلوگ غیروں سے اب کیا گلہ کر سکتا ہوں۔

آپ کا
جوشؔ

(۴) مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۳۷ء

کلیم - دہلی۔

مکرمی!

مدیر جوشؔ ملیح آبادی

یاد آوری اور بیان مقالہ نگاری کا شکریہ قبول فرمائیں۔ میں دسمبر کے مہینے میں ہمہ تن چشم انتظار رہوں گا۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز مند
جوشؔ

اس تناظر میں مسعود حسن رضوی اور جوشؔ ملیح آبادی کے ادبی تعلقات کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ ہستیاں ایک دوسرے کا کتنا احترام کرتی تھیں اور ادب کے دائرے میں رہ کر کس طرح اختلاف رائے کو برداشت کیا جاتا تھا جوشؔ صاحب کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اگر چہ ان دونوں کا کوئی رابطہ نہ رہا اور یہ طویل عرصہ کم و بیش ۲۵ برسوں پر محیط ہے البتہ دونوں طرف یادیں ہی رہ گئیں غالباً یہی وجہ ہے کہ یادوں کی برات میں مسعود حسن رضوی کا کہیں بھی تذکرہ نہیں ملتا تاہم زمانہ طالب علمی سے ان دونوں کے درمیان جو رابطہ قائم ہوا تھا اس کی خوشبو کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے تاریخ ادب کے گمشدہ اوراق کا منظر نامہ تشکیل دیا ہے تاکہ اُردو ادب کے متضاد نظریات کے حامل دو کرداروں کا مکمل حوالہ سامنے آ جائے اور اکیسویں صدی کا محقق جب ان جھروکوں سے

جھانکے تو اسے دونوں تصویریں روشن اور واضح نظر آئیں۔

حوالہ جات

۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامہ از ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۸۹ء صد ۳۲۴۔

۲۔ جوش کی شاعری مکتبہ اُردو ادب، لاہور۔ ص ۷۔

۳۔ یادداشتیں مسعود حسن رضوی ادیب۔

۴۔ ہماری شاعری از سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۱۳۰۔ (آٹھواں ایڈیشن)

۵۔ جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں تحقیق و تدوین ڈاکٹر ہلال نقوی حیات اکیڈمی، کراچی ۱۹۹۲ء، ص ۷۷۔

۶۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے از ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۲۴

۷۔ جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں تحقیق و تدوین ڈاکٹر ہلال نقوی حیات اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۲ء ص ۹۴۔

۸۔ الہام و افکار از جوش ملیح آبادی، مکتبہ ادب جدید لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۱۳۰-۱۲۹۔

۹۔ یادداشتیں از سید مسعود حسن رضوی ادیب۔

۱۰۔ خطوط مشاہیر بنام سید مسعود حسن رضوی انتخاب، ترتیب و تحشیہ نیر مسعود اتر پردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۵ء، ص ۸۸ تا ۹۲۔

نگاراور سرسیّد شناسی کی روایت

ڈاکٹر طاہر تونسوی

نیاز فتح پوری کے نگار کو اُردو کے ادبی رسائل میں ہر اعتبار، ہر حوالے اور ہر تناظر میں ایک انفرادیت حاصل ہے۔ یہ الگ بات کہ نگار نے بے شمار ضخیم اور اہم نمبر نکالے ہیں، تاہم یہ خصوصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ بعض اوقات سارے کا سارا پرچہ نیاز فتح پوری کے قلم کا مرہون منت ہوتا تھا۔ اس پس منظر میں اگر نگار کو ایک تحریک قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

نیاز فتح پوری (1884-1966ء) نے نگار کی ابتدا1922ء میں آگرہ سے کی۔ بعدازاں بھوپال اور لکھنو سے ہوتا ہوا مستقل طور پر کراچی کا ہوگیا اور لحہ موجود تک کراچی ہی سے نکل رہا ہے۔ نگار کی ایک مستقل روایت یہ ہے کہ اس نے خاص شمارے نکالے ہیں۔ نگار کا پہلا خاص نمبر جنوری 1927ء میں ''مومن نمبر'' کی صورت میں شائع ہوا۔ بقول پروفیسر سیّد جاوید اقبال ''علامہ نیاز نے نگار کے خاص نمبروں کے حوالے سے یہ جدت کی تھی کہ سال کا پہلا شمارہ خاص نمبر کیلئے مخصوص کر دیا تھا۔ 1962ء میں نیاز نے نگار کی ذمہ داری ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو سونپ دی۔ انہوں نے نگار کے خاص نمبروں کی روایت کو زندہ رکھا۔''

یوں دیکھا جائے تو خاص نمبروں کا یہ سلسلہ جاری ہے اور اب تو عام شمارے کی جگہ یا تو خاص نمبر آتا ہے یا کوئی خاص کتاب جو نایاب ہوگئی ہوتی ہے۔ اسے چھاپ دیا جاتا ہے، اس طرح محققوں کو ایک دستاویز مہیا ہو جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے زمانے میں نگار کے جو خاص نمبر شائع ہوئے، ان کی تفصیل یہ ہے۔

مومن نمبر	1928ء	بہادر شاہ ظفر نمبر	1930ء
غالب کی شوخیاں نمبر	1932ء	مصحفی نمبر	1939ء

نظیر نمبر	1940ء	ریاض خیر آبادی نمبر	1943ء
حسرت موہانی نمبر	1952ء	داغ نمبر	1953ء
غالب نمبر	1961ء	اقبال نمبر	1962ء

ڈاکٹر فرمان پوری نے درج ذیل نمبر نکالے۔

نیاز فتح پوری نمبر 1	1963ء	ڈاکٹر محمود حسین نمبر	1975ء
نیاز فتح پوری نمبر 2	1963ء	قائداعظم نمبر	1976ء
تذکروں کا تذکرہ نمبر	1964ء	علامہ اقبال نمبر	1977ء
جدید شاعری نمبر	1965ء	مولانا محمد علی جوہر نمبر	1978ء
اصناف ادب نمبر	1966ء	قمر زمانی نمبر	1979ء
اصناف شاعری نمبر	1967ء	خطبات محمود نمبر	1982ء
مسائل ادب نمبر	1968ء	نیاز صدی نمبر	1984ء
غالب صدی نمبر	1969ء	مکتوبات نیاز نمبر	1985ء
سر سیّد نمبر 1	1970ء	غالب بنگاہ نیاز نمبر	1990ء
سر سیّد نمبر 2	1971ء	انجم عظمیٰ نمبر	1991ء
میر انیس نمبر	1971ء	مولوی عبدالحق نمبر	1992ء
مولانا حسرت موہانی نمبر 1	1973ء	فراق گورکھپوری نمبر	1999ء
مولانا حسرت موہانی نمبر 2	1974ء		

اس طرح دیکھا جائے تو چند نمبروں کے علاوہ باقی سب کے سب شخصیات نمبر ہیں، جو شخصیت نگاری اور شخصیت فہمی میں ایک مستند دستاویز ہیں، جہاں تک سر سیّد احمد خان کا تعلق ہے تو یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور المیاتی تاثر کی حامل بھی کہ سوائے سر سیّد نمبر حصہ اول و دوم کے 1922ء سے لے کر لحہ موجود 2001ء تک سر سیّد کے بارے میں صرف پانچ مضمون چھپے ہیں اور ایک مضمون دوبارہ چھاپا گیا ہے۔ اس طرح ان کی تعداد صرف اور صرف چار ہی بنتی ہے، تاہم سر سیّد نمبر چونکہ ایک مکمل دستاویز ہے، اس لیے اسے سر سیّد شناسی

کی ایک روشن مثال تو قرار دیا ہی جا سکتا ہے۔ نگار میں شائع ہونیوالے مضامین کی تفصیل یہ ہے۔

سیّد احمد خان سفر نامہ پنجاب کے آئینے میں	رفیع اللہ عنایتی نگار کراچی مارچ 1961ء
سر سید احمد خان بحیثیت مورخ	ڈاکٹر محمود حسین۔ نگار کراچی مارچ اپریل 1982ء
سر سیّد احمد خان اور راجہ رام موہن رائے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ نگار کراچی جولائی اگست 1982ء+ اپریل 1996ء
اقبال اور سر سیّد احمد خان	ڈاکٹر معین الدین۔ عقیل نگار کراچی دسمبر 1990ء
سر سیّد نمبر حصہ اول	نگار کراچی نومبر دسمبر 1970ء
سر سیّد نمبر حصہ دوم	نگار کراچی جنوری فروری 1971ء

ان نمبروں میں شامل مضامین کی فہرست یوں ہے۔

حصہ اول:

ملاحظات	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
سر سیّد کی ابتدائی زندگی	مولانا الطاف حسین حالی
سر سیّد مرحوم اور اُردو لٹریچر	مولانا شبلی نعمانی
سر سیّد کی تصانیف اور علمی و مذہبی خدمات	مولانا حامد حسن قادری
سر سیّد کا اثر ادبیات اُردو پر	ڈاکٹر سیّد عبداللہ
سر سیّد کی تعلیمی جدوجہد	مولانا حبیب الرحمن خان شروانی
سر سیّد اپنے خطوط کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد عزیز
سر سیّد اور ہندو مسلم اتحاد	پروفیسر ہارون خان شروانی
سر سیّد کا نیا مذہبی طرز فکر	پروفیسر عمر الدین

حصہ دوم:

ملاحظات	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
آنریبل سر سیّد احمد خان بہادر	مولانا عبدالرزاق کانپوری
سیّد احمد خان، شخصیت کے آئینہ میں	علامہ نیاز فتح پوری
سر سیّد کا دینی شعور و فکر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
سر سیّد کا کردار	ڈاکٹر شیخ محمد اکرام
سیّد کا خواب اور اس کی تعبیر	ڈاکٹر سیّد عابد حسین
سر سیّد بحیثیت مورخ	ڈاکٹر محمود حسین
جدید اُردو ادب کا بانی	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
سر سیّد اور مقدمہ شعر و شاعری	ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان
تہذیب اور ادب میں سر سیّد کا کارنامہ	پروفیسر آل احمد سرور
علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو	پروفیسر سیّد احتشام حسین
سر سیّد کا مذہبی شعور	ڈاکٹر شوکت سبزواری
سر سیّد کا طرز ادا	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
تہذیب الاخلاق کی اہمیت	ڈاکٹر سیّد عبداللہ
سر سیّد کا اثر عہد جدید کے مسلمانوں پر	ڈاکٹر عبدالقیوم
سر سیّد کی تاریخی بصیرت	پروفیسر قمر الدین خان
سر سیّد کے ادبی مضامین اور مغرب کے اثرات	ڈاکٹر سیّد شاہ علی
سر سیّد اور مسلمانوں کا ملی اور ثقافتی احیاء	سیّد عابد علی عابد
سر سیّد اور ان کی تحریک	سیّد قدرت نقوی
سر سیّد احمد خان اور ان کی تعلیمی خدمات	سیّد الطاف علی بریلوی
ایک پرانا سوال نیا مسئلہ	شمیم احمد
سر سیّد اور اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر فرمان فتحپوری

محولہ بالا مندرجات پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ علامہ نیاز فتح پوری کی ادارت میں صرف ایک مضمون، نگار 1961ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، باقی کا کریڈٹ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو جاتا ہے۔ اس طرح سر سیّد نمبر حصہ دوم میں علامہ نیاز فتح پوری کا بھی صرف ایک مضمون شامل ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں بہت سے ابتدائی شمارے نہیں دیکھ سکا۔ البتہ مشفق خواجہ صاحب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب اور ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن سے اس سلسلے میں خط و کتابت بھی ہوئی اور گفتگو بھی۔ بہر حال نگار نے سر سیّد شناسی کے ضمن میں جو کچھ کیا ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ نگار میں چھپنے والے مضامین کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سر سیّد کی شخصیت اور ان کے فن کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ سر سیّد نمبر حصہ اول کے ملاحظات میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

> ''ہماری قومی و ملی زندگی کے بیشتر شعبے سر سیّد کی خدمات سے گراں بار ہیں۔ اُردو زبان و ادب پر خصوصاً ان کے احسانات ہیں، ہمارے ادب میں سچی تنقید یعنی اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہنے کی بنیاد سر سیّد نے ڈالی اور ہمارے ادیبوں میں تعلقات و اخلاق کو ذرا دیر کیلئے بالائے طاق رکھ کر کسی ادب پارے یا ادیب پر بے باک رائے دینے کا حوصلہ سر سیّد ہی نے پیدا کیا .... مولانا نیاز فتح پوری مرحوم اور ان کا نگار دوسروں کے سامنے باغی، لیکن سر سیّد کے سامنے ہمیشہ نیاز مند رہے ہیں۔ اسی نیاز مندی کا نشان نگار کا زیر نظر سر سیّد نمبر ہے۔''

اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز فتح پوری خود بھی سرسیّد کی مذہبی اور تمدنی تحریک کے حوالے سے ان سے زیادہ مماثلت رکھتے ہیں۔

مولانا حالی کی حیات جاوید سے سرسیّد کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ اسی طرح مولانا شبلی نعمانی نے سرسیّد مرحوم اور اُردو لٹریچر کے عنوان سے جو معرکتہ الآرا مضمون لکھا تھا وہ بھی اس نمبر میں شامل ہے۔ مولانا حامد حسن قادری نے اپنے مقالے میں سرسیّد کی تصانیف اور عملی و مذہبی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور ان کا مکمل تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا مضمون ''سرسیّد کا اثر ادبیات اُردو پر'' خالصتاً تنقیدی مضمون ہے، جس میں اُردو ادب پر سرسیّد کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نزدیک:

> ''سرسیّد نے اُردو ادب کو جو ذہن دیا، اس کے عناصر ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہونگے۔ مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری۔ سرسیّد کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت انہی بنیادوں پر قائم ہے۔''

اس کے بعد ان کے ادبی نظریات پر بحث کرتے ہوئے سرسیّد کے زیر اثر حالی، شبلی، چراغ علی نذیر احمد اور محسن الملک نے جو کارنامے کیے، ان کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کی تصانیف کے حوالے سے سرسیّد کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

> ''جدید زمانے میں کسی فرد واحد نے اُردو ادب اور عام زندگی کو اتنا متاثر نہیں کیا، جتنا تنہا سرسیّد نے کیا۔''

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے اپنے مضمون میں سرسیّد کی تعلیمی جدوجہد کا مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد عزیز نے سرسیّد کو اپنے خطوط کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پروفیسر ہارون خان شروانی کا مضمون سیّد احمد خان کے ہندو مسلم اتحاد پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ پروفیسر عمر الدین نے سرسیّد کے نئے مذہبی طرز فکر کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور بڑی عرق ریزی اور تفصیل کے ساتھ ان کے خیالات وافکار کو پیش

کیا ہے اور ان کی توجیہات کی نئی سمتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سرسیّد کو خراج دیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نگار کا سرسیّد نمبر حصہ اول سرسیّد کے بارے میں کئی موضوعات کے پس منظر میں معلومات فراہم کرتا ہے اور سرسیّد احمد کی فکر ان کے نظریات ان کے خیالات کو ان کی تحریروں، مکتوبات اور تصنیفات سے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یوں سرسیّد شناسی کی طرف ایک نئے قدم کے مترادف ہے۔

سرسیّد نمبر حصہ دوم کے ملاحظات میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ:

> ''یہ انتخاب کسی مخصوص مکتبہ فکر کی تحریروں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر مکتبہ فکر کے مقالہ نگار شامل ہیں، یعنی اس میں سرسیّد کو کسی مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ اس کے ذریعے سرسیّد کی زندگی اور ادبیات کو مختلف زاویوں سے دیکھنے، پرکھنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی راہ ہموار کی گئی ہے۔''

اس سے اختلاف کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ جتنے مقالہ نگاروں کے مضامین شامل ہیں اور سرسیّد کے جن پہلوؤں پر لکھا گیا ہے، اس میں کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی، بلکہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر نقطہ نظر کے دانشوروں کو سرسیّد کے بارے میں اپنے ہر طرح کے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جائے، تاکہ سرسیّد فہمی کو ہر حوالے اور ہر زاویئے سے مکمل بنایا جائے اور اس کا احاطہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اوپر کے صفحات میں مقالہ نگاروں کے ناموں اور ان کے موضوعات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے کہ آج سے تیس سال قبل انہوں نے سرسیّد شناسی کا ایک بھرپور درواکیا ہے۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری نے اپنے مضمون ''آنریبل سرسیّد احمد خان بہادر'' میں اپنی ملاقاتوں اور بحثوں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ خاص طور پر ان کی سیاسی سوچ اور ہندوستان کی آزادی کے ضمن میں معلومات فراہم کی ہیں، جیسا کہ اوپر ایک جگہ تذکرہ ہوا ہے کہ سرسیّد اور نیاز فتح پوری کے خیالات میں کئی اعتبارات سے یکسانیت اور مماثلت تھی، یہی کیفیت علامہ نیاز فتح پوری کے مقالے ''سیّد احمد خان شخصیت

کے آئینے میں'' میں نظر آتی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

''میں سرسیّد کی غیر معمولی اصلاحی خدمات کے لحاظ سے ان کو صاحب ولایت سمجھتا ہوں، مگر یہ ولایت ان صوفیا کی سی نہ تھی، جو ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر صبر وشکر اور توکل وقناعت کی جامۂ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ولایت ان شیوخ وعلماء کی سی نہ تھی، جن کی اخلاقی تاب و توانائی کا انحصار صرف معجزات وخوارق عادات کے اظہار پر ہوتا ہے، بلکہ سرسیّد کی ولایت تھی پیہم سعی وعمل، اک مسلسل حرکت واضطراب، ایک ہمالیہ کا سا سنگین عزم، ایک کبھی نہ خشک ہونے والی عرق آلود پیشانی اور ایک آگے بڑھ کر کبھی پیچھے نہ ہٹنے والا قدم۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو کارزار حیات میں ایک انسان کو کامیاب بناتی ہیں اور انہیں خصوصیات نے سرسیّد کو بھی غیر معمولی کامیابی بخشی۔''

سرسیّد کی شخصیت کا اس سے بہتر تجزیہ نہیں ہوسکتا۔ علامہ نیاز فتح پوری نے کم سے کم الفاظ میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے، جن کا سرسیّد احمد خان مرقع تھے۔ سعید احمد اکبرآبادی کا مضمون ''سرسیّد کا دینی شعور وفکر'' اور ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کا مضمون ''سرسیّد کا کردار'' خاصے کی چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین نے اپنے مقالے ''سیّد کا خواب اور اسکی تعبیر'' میں یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی بنیادی ذہنی اصلاح اور زندگی کے مختلف شعبوں میں سدھار کیلئے ایک ایسی ہمہ گیر تحریک پیدا کریں، جیسی سرسیّد کے زمانے میں تھی۔ ڈاکٹر محمود حسین نے ''سرسیّد بحیثیت مورخ'' کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور یہ مضمون بعد میں نگار مارچ اپریل 1982ء میں قند مکرر کے طور پر چھپا ہے۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے سرسیّد کی کتب آثار الصنادید، تاریخ فیروز شاہی، جام جم اور سلسلۃ الملوک کے علاوہ سرسیّد کے مضامین اور رسالہ اسباب بغ ہند کے تناظر میں ان کی مورخانہ صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے مندرجات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''اگر سرسیّد نے دوسرے کارہائے نمایاں انجام نہ بھی دیئے ہوتے

تو بھی وہ بحیثیت مورخ کے زندہ رہتے ، مگر ان تاریخی تصانیف کی اہمیت اس سبب سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ سرسیّد نے ایک نہایت مصروف سیاسی اور تعلیمی زندگی گزارنے کے باوجود ایسی تصانیف چھوڑیں جن سے ہندوستانی تاریخ کے بہت سے دھندلے نقوش اجاگر ہو گئے۔''

واقعی اگر سرسیّد اس جانب توجہ نہ کرتے تو یہ پہلو تشنہ رہ جاتا۔ ''جدید اُردو ادب کا بانی'' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مضمون ہے، جس میں انہوں نے سرسیّد کی زندگی کے چار تصنیفی ادوار کے حوالے سے ان کی ادبی خدمات کو بیان کیا ہے اور ان اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے، جو ان کے ہم خیال لکھنے والوں پر مرتب ہوئے اور تہذیب الاخلاق نے اُردو ادب پر جو اثر ڈالا ، اس کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ان کے بقول ''تہذیب الاخلاق نے ہمارے ادب اور انشاء کا رخ بدل دیا'' ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان نے ''سرسیّد اور مقدمہ شعر و شاعری'' کے تناظر میں سرسیّد کی تحریروں سے ان کے تنقیدی نظریات کا سراغ لگایا ہے۔ یہی بات آل احمد سرور کے مضمون ''تہذیب اور ادب میں سرسیّد کا زمانہ'' میں بھی مل جاتی ہے۔ پروفیسر سیّد احتشام حسین نے علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''سرسیّد کے دور میں اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اُردو ادب کی ایک منزل آئی اور ایک نئی منزل کی طرف ادب کا کارواں روانہ ہو گیا، نئے یقین اور نئے حوصلوں کے ساتھ، نئے امکانات اور نئے جذبے کے ساتھ۔ علی گڑھ تحریک کی یہی وہ ممتاز خصوصیت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں ، بلکہ اسے اس تحریک کی بہت سی خامیوں کا کفارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔''

آخری جملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور سیّد احتشام حسین نے صحیح بات کی ہے کہ علی گڑھ تحریک اپنی تمام خصوصیات کے باوجود اپنے اندر اختلافی پہلو بھی رکھتی تھی۔ سرسیّد کا

مذہبی شعور (ڈاکٹر شوکت سبزواری)، سرسیّد کا طرز ادا (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)، تہذیب الاخلاق کی اہمیت (ڈاکٹر سیّد عبداللہ)، سرسیّد کا اثر عہد جدید کے مسلمانوں پر (ڈاکٹر عبدالقیوم)، سرسیّد کی تاریخی بصیرت (پروفیسر قمرالدین خان)، سرسیّد کے ادبی مضامین اور مغرب کے اثرات (ڈاکٹر سیّد شاہ علی)، سرسیّد اور مسلمانوں کا ملی اور ثقافتی احیاء (سیّد عابد علی عابد)، سرسیّد اور ان کی تحریک (سیّد قدرت نقوی)، سرسیّد احمد خان اور ان کی تعلیمی خدمات (سیّد الطاف علی بریلوی)، ایک پرانا سوال نیا مسئلہ (شمیم احمد)، سرسیّد اور اکبرالہ آبادی (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)، سرسیّد اور اُردو میں جدید تحقیق (ڈاکٹر محمود الٰہی)، سرسیّد احمد خان اور وہابی تحریک (پروفیسر محمد ایوب قادری)، سرسیّد کا کامیاب دفاع، حیات جاوید (پروفیسر سلیم اختر)، قوم اور قومیت سرسیّد کے نقطہ نظر سے (ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی) اپنے متنوع موضوعات بحث و تمحیص اور تجزیاتی مطالعوں کے حوالے سے بڑے کارآمد مضامین ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سرسیّد اور اکبرالہ آبادی کے موضوع پر عمدہ مضمون لکھا ہے، یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ اکبرالہ آبادی سرسیّد کے مخالفین میں تھے۔ اگرچہ بعد میں وہ ان کی خدمات کے قائل بھی ہو گئے تھے۔ فاضل مقالہ نگار نے اکبرالہ آبادی کے اشعار کے حوالوں سے سرسیّد پر ان کی طنز کا بھرپور حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے اپنے مقالے ''سرسیّد اور اُردو میں جدید تحقیق'' میں سرسیّد کی محققانہ کاوشوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جدید اُردو تحقیق سرسیّد کی دکھائی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ پروفیسر سلیم اختر نے جو ابھی ڈاکٹر نہیں بنے تھے، مگر اُردو تنقید کا معتبر حوالہ ضرور تھے۔ انہوں نے اپنے مضمون ''سرسیّد کا کامیاب دفاع، حیات جاوید'' میں ان تمام عوامل و محرکات کا جائزہ لیا ہے ، جن کی بدولت حالی نے سرسیّد کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور شبلی کے مدلل مداحی کہنے کے باوجود اس کی اہمیت کم نہیں ہوتی اور ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول ''بحیثیت مجموعی'' حیات جاوید ''سرسیّد کا کامیاب دفاع ہے۔

اس پس منظر میں نگار کے دونوں سرسیّد نمبر اعلیٰ پائے کی ایک ایسی کارآمد دستاویز ہیں، جو سرسیّد پر کام کرنیوالوں کیلئے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں اور سرسیّد کی تحریک اور اس کی

خدمات کی اعترافی شکل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

جہاں تک نگار میں چھپنے والے مضامین کا تعلق ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے رفیع اللہ عنایتی کا مضمون ''سیّد احمد خان سفر نامہ پنجاب کے آئینے میں'' نیاز فتح پوری کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس میں مضمون نگار نے سرسیّد کے سفر نامہ میں شامل افکار و خیالات کا مطالعہ کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ آزاد ملک میں بسنے والے سارے لوگ اشتراک سے کام کریں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقالے ''سرسیّد احمد خان اور راجہ موہن رائے'' میں جنوبی ایشیاء کی ان دو شخصیات کے اثرات کا جائزہ لیا ہے، جو ان کی وجہ سے سیاسی اور تہذیبی زندگی پر مرتب ہوئے اور انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایک کی تحریک کا تعلق ہندو قومیت سے رہا اور دوسرے کا مسلم قومیت سے۔ راجہ رام موہن کی تحریروں کے حوالے دے کر ان کی ہندوانہ ذہنیت کا مطالعہ کیا گیا ہے اور سرسیّد احمد خان کی مسلم سوچ کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ ایک طرح کا تقابلی مطالعہ ہے۔ آخر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''یہ ہے وہ پس منظر جس میں سرسیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک پروان چڑھی اور جس میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے مدمقابل مسلمانوں کو ایک جداگانہ پلیٹ فارم پر جمع ہونے اور اپنے سیاسی و تہذیبی حقوق کی مدافعت کرنے کی ترغیب دی۔''

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے مقالے ''اقبال اور سرسیّد احمد خان'' میں ان دونوں شخصیات کے مشترک ذہنی رویوں کے بارے میں سیر حاصل بات کی ہے اور علامہ اقبال جس طرح سرسیّد تحریک سے واقف اور اس کے مقاصد جلیلہ سے فیض یاب ہوئے، اس کا تذکرہ اس میں موجود ہے اور خود اقبال نے جو اعترافات کیے ہیں، ان کا ذکر بھی نمایاں ہے۔ بقول اقبال:

> ''اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردعمل کیا۔''

اسی طرح ایک جگہ اقبال فرماتے ہیں:

''یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی تحریک تھی''

اور پھر اس کی تائید بھی خود کرتے ہوئے فرمایا

''میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سیّد احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔''

ڈاکٹر معین الدین عقیل مستند حوالوں سے تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''ہندوستان اور مسلمانوں کی حد تک جو مسائل درپیش رہے، ان کے تعلق سے تو مقاصد نصب العین اور اصول و نظریئے دونوں میں بڑی حد تک یکسانیت اور مماثلت ہے۔''

سر سیّد کے بارے میں مضامین و مقالات کے اس اجمالی تجزیئے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نگار نے سر سیّد کی تحریک کے نقوش ابھارنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور اس کی دھندلاہٹ کو نمایاں، روشن اور منور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اسکا سارا کریڈٹ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو جاتا ہے۔

سرائیکی وار دو کا مشترکہ لسانی منظر نامہ

نوراللغات کے مرتب اور مدون مولوی نورالحسن نیر مقدمے میں رقمطراز ہیں " زبان اردو کا وسیع باغ رنگ برنگ پھولوں سے بھرا پڑا ایسا مہک رہا ہے کہ شاید ہندوستان کا کوئی دماغ ایسا نہ ہو جس میں اس کی خوشبو کی لپٹیں نہ پہنچی ہوں لیکن پھول اس کثرت سے اور ایسی مختلف شکل وشباہت کے ہیں کہ آج تمیز کرنا دشوار ہے کہ کس پھول کا پودا کہاں سے لایا گیا۔ جڑ کہاں سے پھوٹی اور اختلاف آب وہوا نے رنگ پر کیا اثر کیا۔ ہر ایک پھول میں کئی طرح کی خوشبو موجود ہے جس کا امتیاز آسان نہیں کہیں کہیں ایسا بھی ہے کہ ذرا سا بھی تغیر متبدل نہیں ہوا اور کبھی تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد لفظ نے اردو کا قالب اختیار کرلیا۔ قدر کرنے والے اردو کی بھینی بھینی خوشبو سے ایسے مست ہیں کہ اس امر کی تحقیقات کی بہت کم نوبت آتی ہے کہ یہ پھول کس پہاڑ سے آیا یا جنگ سے یا کسی شہر کے خانہ باغ سے اور اپنی سرزمین سے نکل کر دوسری سرزمین میں اس نے کیا رنگ بدلا"

-ii حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں لکھا ہے:-

" انہی ایام میں ملتانی لوگ بھی جوق در جوق جا کر دہلی میں آباد ہو گئے۔ تاریخ میں سب سے پہلے ان ملتانیوں کا ذکر غیاث الدین بلبن کے عہد میں ملتا ہے۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں وہ سلطنت کے معاملات میں بھی دخیل تھے"

-iii ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو جلد اول میں لکھتے ہیں:-

" اس صدی کے اوائل میں جب اہل پنجاب اس بات کا دعویٰ کر رہے تھے کہ اردو کا مولد پنجاب ہے اور اہل زبان اس وقت تک اس دعوے کو تسلیم کرنے پس وپیش کر رہے تھے اس لئے کہ قدیم اردو کے وہ مخطوطات سامنے نہیں آئے تھے جو 1960ء کے بعد شائع ہوئے اور جن کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ پنجاب اردو سے وہی تعلق ہی جو ایک ماں کا بیٹی سے ہوتا ہے"

iv- سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں لکھا ہے:-

"مسلمانوں کی عربی وفارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے" ان چاروں اقتباسات کو درج کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ پر اپنے موضوع کی معنویت واضح کرتا چلوں کہ میں اپنے موضوع کی بحث کس نہج پر کرنا چاہتا ہوں اس تناظر میں یہ بات اب احتلافی نہیں رہی کہ اردو کا مولد پنجاب ہے اس میں سندھ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور یوں یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ اردو کی ابتداء اور اس کی نشو ونما سندھ کی زبانوں سے ہوتی ہے خاص طور پر اس سلسلے میں ملتانی یعنی سرائیکی اور سندھی زبان کو کسی طور بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے البتہ ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کے وقت سندھ اور ملتان کے صوبہ جات کی سرحدیں کابل تک پھیلی ہوئی تھیں اور پھر یہ بھی کہ ملتان میں تو سرائیکی زبان رائج تھی مگر سندھ میں بھی اس کا بڑا چرچا تھا اور اس قدیم عہد میں بھی سرائیکی پورے سندھ پر حاوی تھی۔ میرے اس دعوے کے ثبوت میں پیر حسام الدین راشدی کے یہ جملے دیکھئے۔

"قدیم سندھی اور مغربی ہند کی بولیوں نے اسلامی زبانوں کا سب سے پہلے اثر قبول کیا اور کچھ شک نہیں کہ سندھی اور ملتانی ہی میں اردو زبان کا بیج پڑا"۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اپنی تحقیقی کتاب "سرائیکی اور اس کی ہمسایہ علاقائی زبانیں" میں زبانوں کی بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سرائیکی زبان ہی ہندوستان کی لنگوافرینکا تھی۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

> "تاریخی جغرافیائی اور لسانی شواہد سب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ وادی سندھ کی یہ جدید زبان جو فارسی اور عربی سے مزین ہو چکی تھی اور قبول عام کی سند لے کر ہندوپاک کے اطراف وجوانب تک پھیل چکی تھی ملک کی سب سے بڑی لنگوافرینکا بھی تھی کیونکہ اس زبان کو بولنے اور جاننے والا سارے ہندوستان میں باآسانی گھوم پھر سکتا تھا اور ہر طبقے

کے لوگوں سے بغیر کسی لسانی دقت کے بات چیت کر سکتا تھا"۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق کی یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لمحہ موجود میں بھی سرائیکی کی یہی کیفیت اور پوزیشن ہے اور یوں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سرائیکی برصغیر پاک و ہند کی قدیم ترین اور وسیع ترین زبان ہے اور اس کی افادیت کا پتہ اس طرح بھی لگ سکتا ہے کہ شیخ محمد اکرام نے "آب کوثر" میں لکھا ہے:

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری لاہور سے ہندوستان کی طرف جانے لگے تو انہیں ایسی زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی جو ان کے فریضہ تبلیغ اسلام میں معاون ثابت ہو سکتی اور جو ہر چھوٹے بڑے مقام پر بولی اور سمجھی جاتی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ ملتان تشریف لے گئے جہاں طویل قیام کے بعد مقامی زبان میں مہارت حاصل کی اس کے بعد دہلی آئے"۔

ظاہر ہے کہ یہ مقامی زبان سرائیکی ہی تھی۔ سرائیکی کی قدامت کا اندازہ "جارج گریسن کی لنگوسٹک سروے آف انڈیا" جلد ہشتم اور ڈاکٹر ٹرمپ کی سندھی گرامر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جارج گریسن نے لکھا ہے:

"سندھی کی جدید ترین بولی کا نام سرائیکی ہے نیز یہ کہ سرائیکی اس زبان کی سب سے زیادہ خالص شکل ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی تمام بولیوں میں سرائیکی زبان کے الفاظ موجود ہیں اور اس کی وجہ ملتانی سوداگر ملتانی معمار اور ملتانی ذاکرین ہیں۔

ڈاکٹر میمن عبدالحمید سندھی نے "لسانیات پاکستان" میں لکھا ہے:

"حافظ محمود شیرانی نے پاکستان کی قومی زبان اردو کی وحدت اور پیدائش کے لئے جس علاقے کا ذکر کیا ہے وہ دراصل سندھ اور پنجاب کا مشترکہ علاقہ ہے عرب سیاحوں کے بیان کے مطابق ملتان اور سندھ کے لوگ

فارسی اور سندھی بولتے تھے اور یہی زبان ہے جس میں سندھی اور فارسی
کے امتزاج سے مغربی پاکستان میں پنجابی ہند کو ملتانی یا سرائیکی اور شمالی
ہندوستان کے گردو نواح میں ہریانی، دہلی میں کھڑی بولی اور آگرے
میں برج بھاشا اور دکن میں دکنی کو نئی صورت عطا کی اور پھر اس زبان کا
مشترکہ سرمایہ اردو قرار پایا"۔

اس اقتباس سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے تاہم اس میں یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ سندھی کے ساتھ ساتھ سرائیکی بھی سندھ کے علاقوں میں وسیع پیمانے پر بولی جاتی تھی۔ حافظ محمود شیرانی نے اردو اور ملتانی کی مشابہت کا ذکر کرتے ہوئے ہوئے لکھا ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی کے زیادہ قریب ہے
دونوں میں اسماء افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا
طریقہ مشترک ہے یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں صرف
جملوں کے اہم اجزاء بلکہ ان توابعات وملحقات بھی ایک ہی قاعدہ جاری
ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر تانیث کے قواعد بھی ایک سے رکھتی ہیں"

اس ساری گفتگو اور ان سارے حوالوں کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ اردو زبان کی ابتداء اور نشوونما میں سرائیکی کا بیش بہا حصہ ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" اس کا عملی ثبوت ہے اور یوں بھی اب جب لسانیات کا علم حیرت انگیز حد تک ترقی کر چکا ہے اردو پر دیگر زبانوں کے اثرات کا جائزہ لینا مشکل نہیں رہا۔ الفاظ، آوازوں، اسماء افعال اور دیگر شواہد سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہو گیا ہے کہ اردو میں کس زبان کے کتنے لفظ داخل ہوئے ہیں اور ان میں سے کتنے خوابیدہ ہو چکے ہیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو کی تعمیر وترقی میں کس زبان کا کتنا حصہ ہے چنانچہ ہم اگر قدیم اردو کا جائزہ لیں تو سرائیکی زبان اس پر حاوی نظر آتی ہے۔ امیر خسرو جیسا شاعر بھی اپنے فارسی کلام میں سرائیکی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے دیکھئے۔

من کہ بر سرنے نہادم گل

باز بر سر نہادو گفتار جل ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم اردو کی جو لغت مرتب کی ہے اس میں بیس فی صد الفاظ سرائیکی کے ہیں اور ان الفاظ کو پروفیسر شوکت مغل نے اپنی کتاب "قدیم اردو کی لغت اور سرائیکی زبان" میں درج کر دیا ہے اور پھر "اردو میں سرائیکی زبان کے انمٹ نقوش" میں انہوں نے ولی دکنی، میر تقی میر، میر درد، مثنوی سحر البیان، باغ و بہار، مذہب عشق (نہال چند لاہوری) رانی کیتکی کی کہانی، غالب کے خطوط، طرح دار لونڈی (منشی سجاد حسین) سے سرائیکی الفاظ الگ کر دیئے ہیں چند مثالیں دیکھئے:

باندھ پٹکا سات گز کا دے کے بل

نہ کر دیوار کا مجلس میں تکیہ

(مبارک شاہ آبرو)

مرے مونڈھے سے مونڈھا لگا بیٹھ

(میر تقی میر)

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں تھیں

(میر تقی میر)

ابھی اوپر امیر خسرو کے ایک شعر کا میں نے حوالہ دیا تھا اس کی کتاب خالق باری میں مثال دیکھئے۔

بھائی رے ملا جو ہم کوں پار اتار

ہاتھ کا دیوانگی مندرا گل کا دیوں گی ہار

دشمن بیری کوس دمامہ باراں مینہ

عشق محبت عاشق متر جانی مینہ

اسی طرح ولی دکنی کے ہاں اٹکن، بے وقر، بانسلی، بچن، دوانا، جگ، ڈوجا، دان، ڈیوے، ڈیوا، کیتا

ہوں، لون، پیا، مجھی وغیرہ۔

میر تقی میر کے ہاں اگوں، بے طاقتی، بانگ، بے دید، بدزبان، بھڑن، پڑی، پلے، پرے تیں تیئں، تنور، ٹھیکر، ٹھکن، ہتھ ملن، دان کرن

میر حسن کے ہاں موئے، موئے جینیں، دوشالہ، صفا کرن، چق، ساریاں میر امن کی باغ و بہار کیس ماندی تھیون، پانی ڈیون آلا، کھب ونجن، لون روتی ملن، لڑھن، چوون، کڑھن، تپ چڑھن، گزران، کھسا، ان چت رانی کیتی کی کہانی میں ٹرن، سیوا، بکھیڑے، جتاون، بھاون، اور اسی قبیل کے الفاظ سرائیکی زبان کا سرمایہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کا بھی علمی ولسانی سرمایہ ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے:

> "ملتان اور بہاولپور کے علاوہ اور آندھرا پردیش میں یک گونہ مناسبت بھی ہے اور سرائیکی زبان کے متعدد الفاظ سہروردی سلسلے کے صوفیائے کرام کے زریعے دکن کی علاقائی زبانوں میں اس درجہ رچ بس گئے ہیں کہ دکن کی جس زبان کے لئے "قدیم اردو" کا نام تجویز کیا گیا ہے اس کے خزانہ لغت میں سرائیکی الفاظ کی ریل پیل ہے"۔

اور یقینی طور پر ایسا ہی ہے کہ اردو سرائیکی زبان کے خمیر سے اٹھی ہے اور فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ سرائیکی کا بھی دودھ پی کر پاتی ہے اور اس کا جو مشترکہ لسانی رشتہ واضح منظر نامہ تشکیل دیتا ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور اس بات کے دہرانے میں کوئی حرج نہیں کہ اردو کی نشو ونما میں سرائیکی کا بیش تر اور بیش بہا حصہ ہے۔ لحہ موجود میں یہ رشتہ اور یہ سلسلہ قائم و دائم بھی ہے اور جاری و ساری بھی کہ سرائیکی الفاظ اردو میں اور اردو کے الفاظ سرائیکی میں داخل ہو رہے ہیں اور یوں ایک نئی زبان تشکیل پا رہی ہے جسے ڈاکٹر عطش درانی پاکستانی اردو کہتے ہیں۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ تحریر و تقریر اور میڈیا میں دونوں زبانوں کا ایک مسلسل اشتراک دکھائی دیتا ہے اور اس حوالے سے دونوں زبانوں کا ذخیرہ الفاظ بڑھ رہا ہے اور قومی یک جہتی کے تناظر میں دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آتی جارہی ہیں اور یہ ایک خوش آئند بات بھی ہے اور زندہ زبانوں کا وطیرہ بھی ----

اردو زبان اور قومیت کی تشکیل

(ڈاکٹر طاہر تونسوی)

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد ہی سے قومی زبان اور قومیت کی تشکیل کا سوال ابھرا تھا اور جس کی تحریک پاکستان سے لے کر قیام پاکستان تک سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی حوالے سے دخل رہا اور اب ایک ناگزیر حقیقت بن چکا ہے۔ یہ سوال پاکستانی قوم کے لئے ہر دور میں لمحہ فکریہ رہا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ سوال محض "نظریہ ضرورت" کا نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کا موضوع بھی یہی تھا۔ حال کا موضوع بھی یہی ہے۔ اور مستقبل کا موضوع بھی یہی رہے گا اور اس کے پس منظر میں جو محرکات اور جو معاملات ہیں وہ بھی زیر بحث آتے رہیں گے۔

قومی زبان اور قومیت کی تشکیل یا قومی یک جہتی کے موضوع پر بات کرتے ہوئے ہمیں ان دونوں اصطلاحوں پر الگ الگ بحث کرنا ہوگی اور پھر ان دونوں کے مشترک رشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کسی منطقی اور حتمی نتیجے پر پہنچنا ہوگا۔ اس تناظر میں جو بھی سوال ابھریں گے ان کا جواب بھی دینا ہوگا تا کہ اس گھمبیر مسئلے کے حل کے لئے روشن امکانات پیدا ہوسکیں اور ایک ایسی فضا بن جائے جو افہام و تفہیم کا منظرنامہ تشکیل کر سکے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اب ہم ایک پاکستانی قوم ہیں اور پاکستانی قوم ہونے کے ناطے ہمارا الگ تشخص اور انفرادی شناخت ہے اور اس میں سب سے بڑا حوالہ اسلام ہے۔

محمد الیاس فارانی نے صحیح لکھا ہے:

> "پاکستان جس میں آج ہم ایک آزاد قوم اور خودمختار اسلامی مملکت کے وارث کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور جس کی قومی زبان عربی فارسی یا ترکی نہیں بلکہ اس علاقے کی زائیدہ و پروردہ اور مقبول عام زبان اردو ہے۔ بظاہر 14- اگست 1947ء کو وجود میں آیا ہے لیکن جس خاص نقطہ نظر کے تحت پاکستان نے جنم لیا اور جسے یہ شکل سنوارنے کے بعد ہمیں قومی آزادی اور قومی زبان میسر آئی۔ اس کی تاریخ نئی نہیں کئی سو

سال پرانی ہے۔ اتنی ہی پرانی جتنی کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد
۔۔۔۔۔اس لحاظ سے قائداعظم کا یہ فرمان ان کی بصیرت کا ثبوت ہے
کہ:"

پاکستان اس دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو
مسلمان ہوا تھا"۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں
ہوئی تھی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے وطن نہیں اور نہ نسل۔
ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہ رہا۔ ایک
جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا اور ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ
گئی"۔(1)

یوں مسلم قومیت اور پاکستانی قومیت مملکت خداداد پاکستان کا امتیازی نشان ٹھہری اور چونکہ اس قومیت نے ایک حوالے سے اس خطے میں جنم لیا۔ اس لئے اس کی زبان کا اہک اہم عنصر قرار پائی اور زبان ہی مسلم قومیت یا پاکستانی قومیت کے تشخص کا ذریعہ بنی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ رائے میرے موضوع کو تقویت دیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

" قوم اور قومیت کی تشکیل و تعمیر میں دوسرے عناصر کے ساتھ زبان
نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خاص طور پر جمہوری نظام میں جہاں
حکومت کا حق افرادی اکثریت رکھنے والی قوم کو حاصل ہوتا ہے زبان کی
اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جمہوری نظام کو کامیابی سے چلانے
کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جس قوم کے افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی
باگ ڈور ہو۔ ان میں ایک طرح کی ذہنی جذباتی اور ثقافتی یگانگت بھی
پائی جاتی ہو اس یگانگت کے بغیر جمہوری حکومت اور اس کے ادارے

انتشار اور بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے عزائم اور فیصلے بے اثر
اور ان کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں لیکن اس قسم کی قومی یگانگت
جو آزادی اور آزاد مملکتوں کی ترقی کی ضمانت دے سکے بالعموم قومی زبان
سے پیدا ہوتی ہے قوم بغیر قومی زبان کے گونگی اور بے وقعت اور زبان
بغیر قوم کے غیر موثر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے"۔ (2)

گویا قومیت کے لئے قومی زبان کا وجود ناگزیر ٹھرایا یوں کہہ لیجئے کہ قومیت کے لئے زبان اور زبا
کے لئے قومیت کا ہونا ضروری ہو گیا۔ جب یہ طے ہو گیا کہ پاکستان مسلم قومیت کا خطہ ہے تو پھر ا
زبان کیا ہوگی یا ہونی چاہیے۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اردو ہی ہماری قومی زبان ہے، ہماری تہذیب
اور کلچر کا توانا ایک توانا نشان۔ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں برابر کی شریک۔۔۔۔ جامعیت
اور وسعت پذیری کی مثال۔۔۔۔ کرہ ارض پر جہاں بھی انسانی وجود ہے وہاں بولی اور سمجھی جانے
والی۔۔۔۔ ادارہ یونیسکو کے سروے کے مطابق دنیا بھر میں انگریزی اور چینی کے بعد تیسری بڑی زبان۔۔۔
اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اردو مقاصد پاکستان میں ایک اہم ترین فیکٹر کی حیثیت سے شامل رہی۔ اردو
ہندی تنازع کی وجہ سے سیاسی مسئلہ بنی اور دو قومی نظریے کا سبب ٹھہری۔ ہندوؤں نے ہندی سے اور مسلمانوں
نے اردو سے وابستگی اختیار کی۔ تقسیم کے بعد ہندی ہندوستان کی اور اردو پاکستان کی قومی زبان بن گئی اور اس
سلسلہ میں جو شکوک و شبہات کسی بھی طرف سے ابھرتے رہے روح پاکستان قائداعظم انہیں دور کرتے رہے۔
ڈھاکہ میں 21-مارچ 1948ء (4) کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی
اور کوئی دوسری نہیں جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ درحقیقت
پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو مضبوط
بنیادوں پر متحد و یکجا رہ سکتی ہے اور نہ ہی بحیثیت قوم اپنا کردار ادا کر سکتی
ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے پس جہاں تک

سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی زبان اردو ہو گی"۔ اسی طرح ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد (5) منعقدہ 24- مارچ 1948ء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہو، صرف ایک ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ ملک کی سرکاری زبان بھی ظاہر ہے اردو ہی کو ہونا چاہئے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے پروان چڑھایا ہے اور جیسے پاکستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک سمجھا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو میں دوسری صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیب وثقافت کا بہترین سرمایہ پایا جاتا ہے۔ اور اردو ہی دوسرے اسلامی ملکوں میں بولی جانے والی زبانوں سے قریب تر ہے"۔

جہاں ان اقتباسات سے قائداعظم کی زبان کے بارے میں حتمی اور دوٹوک فیصلے کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سرکاری زبان سے مراد قومی زبان ہے جو پاکستان میں پوری مسلم قومیت کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کا مذہب سے بھی گہرا رابطہ ہے اور یوں مسلم ثقافت کا حوالہ بھی ہے اس لئے اس میں عربی اور فارسی کا سارا سرمایہ ترجے کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسی لئے غلام محمد نے اپنے مضمون "اردو زبان کی عظمت اور دینی اہمیت" میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی اردو کانفرنس ناگپور مارچ 1940ء میں کی گئی ایک تقریر کا خلاصہ یوں دیا ہے۔

"اس وقت اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے۔ اس بنا پر یہ حفاظت حسب استطاعت واجب اور اطاعت ہو اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت کرنا معصیت وموجب مواخذہ آخرت ہوگا۔"

اپنے مندرجات کے اعتبار سے یہ ایک طرح کا فتویٰ بھی ہے جو واضح اظہار رکھتا ہے۔ دوسرے

معنوں میں اردو زبان کے زریعے دین کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے اور دیا بھی جارہا ہے۔ اس حوالے سے یہ بات ایکبار پھر طے ہوئی کہ اردو ہماری زندگی کا جزو اور تہذیب و کلچر کی اساس ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قومی یکجہتی سے کیا مراد ہے اور اس کے لئے قومی زبان کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ صاف الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی ملک مین بسنے والے اور سانس لینے والے افراد ایک ہی طرح سوچتے ہوں، ایک طرح کے نظریات رکھتے ہوئے اور قومی مسائل پر متفقہ رائے رکھتے ہوئے اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ قومی یکجہتی کے پانچ عناصر ہوسکتے ہیں یعنی مذہب، جغرافیہ، تاریخ ثقافت اور زبان۔

پاکستان کے تناظر میں یہ دیکھیں تو یہاں مسلم قومیت بستی ہے جس کا مذہب بھی ایک ہے اور جغرافیہ بھی تاریخ بھی ایک ہے اور کلچر بھی۔ اگرچہ ثقافت اور کلچر کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح قومی زبان تو ایک ہے مگر مختلف علاقوں اور صوبوں میں بولی جانے والی مختلف پاکستانی زبانیں الگ ہیں۔ مگر ان سب زبانوں میں رابطے کا ذریعہ اور حوالہ قومی زبان یعنی اردو ہی بنتی ہے اس لئے کہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے گویا اردو رابطے کی زبان ہے سندھ کے سابق وزیر تعلیم سید غوث علی شاہ نے صحیح سوچ کا مظاہرہ ان الفاظ (7) میں کیا ہے۔

"پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی زبانیں چار ستون ہیں جس پر اردو
کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ملک میں جو چار پانچ
زبانیں بولی جاتی ہیں اردو ان کے درمیان ایک رابطہ ہے۔"

علاقائی یا پاکستانی زبانوں کی بات چل نکلی ہے تو یہ بات سب مانتے ہیں کہ زبانیں ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہوتیں بلکہ انہیں بولنے والے افراد ایسی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں اور زبان کی بنیاد پر اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ لسانی فسادات اس کی ایک مثال ہیں۔ حالانکہ ایسی صورت نہیں ہے اردو یعنی قومی زبان کا تو کسی سے جھگڑا بھی نہیں بلکہ وہ تو ایسی صلح جو اور کشادہ دل ہے کہ ہر زبان کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور پھر اس طرح اپنا جز بناتی ہے کہ نہ جیسے وہ اسی کا ہو اور کسی دوسری زبان سے نہ اپنایا گیا ہو۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں۔

"اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی رنگ و نسل، ایک ہی

خون، ایک ہی آسمان، ایک ہی زمین ایک ہی انداز فکر اور ایک ہی طرز ادا
کا رشتہ ہے۔ اردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف نہیں بلکہ
عزیز و رفیق ہیں۔"

یہ رویہ ایک کشادہ دل ادیب کا ہے ورنہ اردو بولنے والے ایسے بھی ہے جو اس کے برعکس رویہ رکھتے ہیں اور ان کے اس رویے سے اردو کو نقصان پہنچتا ہے۔

دیکھا جائے تو مذہب، جغرافیہ اور تاریخ کے بعد کلچر ہی وہ عنصر ہے جو قومی یکجہتی کے سلسلے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے گویا قومی یکجہتی کے لیے پاکستانی کلچر کی بڑی اہمیت ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے بجا طور پر لکھا ہے۔

"جس قوم کو اپنے کلچر کا شعور نہ ہو تو وہ روحانی طور پر منتشر رہے گی۔ قوم کی
انفرادیت اس کے انفرادی کلچر میں پوشیدہ ہوتی ہے اور قومی انفرادیت
کے مکمل اور غیر مبہم شعور کے بغیر قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا خواب تعبیر کو ترستا
ہے۔"

مگر یہاں اہم بات یہ ہے کہ ہم پاکستانی کلچر کے خدوخال بھی نمایاں نہیں کر سکتے اور ابھی تک اس کی شناخت اور پہچان کے مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے کیا عوامل، دشواریاں، مشکلات اور مصلحتیں ہیں فی الحال ان سے قطع نظر ہمیں احمد ندیم قاسمی کے اس انداز فکر کی طرف غور کرنا پڑے گا کہ:

"جب ہم قومی یکجہتی کی تمنا کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ ہماری
نسل ایک ہو، لباس ایک ہو اور زبان ایک ہو۔ قومی یکجہتی کی شرط صرف یہ
ہے کہ ہماری تاریخ ایک ہو۔ ہمارا نصب العین ایک ہو۔ ہمارا منتہائے
مقصود ایک ہو۔ قومی سطح پر ہماری نفسیاتی فضا ایک ہو اور ہماری علاقائی
تہذیبیں ایک وسیع قومی تہذیب کے عناصر ترکیبی ہوں۔"

اس حوالے سے یہ بات سوچنے کی ہے کہ ہمیں پاکستانی کلچر کے خدوخال متعین کرنے کے لئے کیا

کرنا ہوگا اور اپنے اپنے علاقائی خول سے نکل کر وسیع قومی تہذیب کے عناصر ترکیبی کو کس طرح جوڑنا ہوگا میرے نزدیک اس پل پراط سے بخیر وخوبی گزرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم قومی زبان یعنی اردو کو اس کے لئے وسیلہ بنائیں تا کہ فروعی اختلافات اور انفرادی امتیازات اپنی موت مر جائیں اور قومی اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا ہو جو نہ صرف ہماری ذات کے لئے بلکہ وطن عزیز کی بقاء کی ضامن ہو بصورت دیگر

ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اگر ایسا ہوا تو ہم ایسے ایسے قومی المیے سے دوچار ہوں گے۔ جس کی جانب بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بزم اقبال کراچی کی 22 اپریل 1950ء کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

"وہ زبان جو قرآن پاک اور آسمانی صحیفوں کا ترجمہ کر سکتی ہے جو علم وفن کے موضوعات پر بحث کر سکتی ہے، جو غالب، سرسید، حالی اور اقبال کے خیالات و جذبات کو ادا کر سکتی ہے کیا وہ دفتروں کی معمولی مسلوں کے مطالب کو ادا نہیں کر سکتی۔ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ قومی زبان کی توہین کرتا ہے۔ یاد رکھیے اگر ہم نے اس کی قدر نہ کی اور اس کو وہ درجہ نہ دیا جس کی وہ مستحق ہے تو پاکستان کے استحکام میں خلل واقع ہو جائے گا اور پشتونستان، بنگالستان، سندھ جیسے استان بن جائیں گے اور پاکستان ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔"

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب ہم نے بنگالی کو دوسری قومی زبان قرار دیا تو اس کا نتیجہ بنگلہ دیش کی صورت میں نکلا جس کا ہم اب کف افسوس مل رہے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ ہمارا نظام حلیم ہے جو گزشتہ نصف صدی سے ہمارے تجربات کی زد میں ہے۔ مسعود مفتی نے اپنی کتاب "لمحے" میں سقوط ڈھاکہ کی روداد میں لکھا ہے۔

ایک شخص جس کا بیٹا مکتی باہنی میں شریک ہو کر پاک فوج کے خلاف لڑ رہا تھا مجھ سے ملا اور کہا" بحیثیت ایجوکیشن سیکرٹری آپ جس کرسی پر بیٹھے

ہیں مجھے اس کرسی کے تساہل کی سزا مل رہی ہے میرا بچہ پیدائشی پاکستانی
تھا مگر آپ کے نظام تعلیم نے اسے غیر پاکستانی بنادیا۔"

یوں دیکھیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ قومی زبان اور قومی یکجہتی کے لئے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی ضرورت کا سوال اہم ہے۔ اس لئے کہ قومیت کی تشکیل اور قومی یکجہتی کی تعمیر میں نظام تعلیم کا کردار بنیادی اور اساسی نوعیت کا ہے اور جواب یہ ہم قومی یکجہتی کے نہ ہونے کا رونا رو رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری ہمارے ناقص نظام تعلیم اور غلط تعلیمی منصوبہ بندی پر عائد ہوتی ہے۔

آج پاکستان جس طرح کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی اور بین الصوبائی حالات سے دوچار ہے اس کی صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے اور ہر شخص اپنا الگ راگ الاپ رہا ہے خاص طور پر کراچی کی جو کیفیت ہے وہ ہر محب وطن کے لئے تشویش کا باعث ہے۔ اگرچہ جمہوریت کا سورج طلوع بھی ہو چکا ہے پھر بھی سیاسی عدم استحکام کی فضا نظر آ رہی ہے۔ اس لئے ہمارے سیاسی لیڈر بہت سے قومی مسائل پر متفق نہیں ہو رہے اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس سارے پس منظر میں قومی یکجہتی کی اہمیت اور افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور یہ تمنا و آرزو پیدا ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں ہر ذمہ دار شہری اپنی ذمہ داری کا احساس کرے اور ارباب اقتدار، اراکین اپوزیشن، علمائے کرام اور اہل بینش و دانش اپنا قومی فرض نبھانے کے لئے اپنے فروعی اور ذاتی اختلافات دور کر کے سنجیدگی سے اس مسئلے کے بارے میں نہ صرف سوچیں بلکہ عملی اقدامات بھی کریں۔ میرے نزدیک قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے جہاں تمام صوبوں میں بسنے والے لوگوں کے درمیان اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا کی جائے وہاں انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے اور سمجھنے کی کوئی صورت نکالی جائے تا کہ تذبذب اور بے چینی کا خاتمہ ہو سکے۔

اس تناظر میں چند ایک اقدامات کرنے بے حد ضروری ہیں۔

الف: جیسا کہ نظام تعلیم کے بارے میں کہا گیا ہے لازمی ہے کہ اسے جدید انداز میں سائنٹیفک بنیادوں پر از سر نو مرتب کیا جائے اور تمام علاقوں میں ایک ہی نصاب ہو جو قومی امنگوں کا ترجمان بھی یکجہتی کا آئینہ دار بھی۔

ب: ملک کے چاروں صوبوں میں پاکستانی زبانوں کے پڑھانے کا انتظام کیا جائے اور حوالے سے ہر صوبے کی پاکستانی زبانوں کی دوسرے صوبوں میں تدریس کا بندوبست ہو۔ یعنی صوبہ سندھ میں پنجابی، سرائیکی، سندھی اور پشتو، صوبہ پنجاب میں سندھی، بلوچی اور پشتو زبانوں کی تعلیم دی جائے اور انہیں محض نصاب کا حصہ نہ بنایا جائے بلکہ اس منصوبے کو عملی طور پر مروج کیا جائے۔

ج: ہر صوبے میں دیگر صوبوں کے اساتذہ تعینات کئے جائے اور انہیں ہر ممکنہ سہولتیں بھی دی جائیں تا کہ یہ بتادلے یا تعیناتی سزا تصور نہ ہو۔ علاوہ ازیں اس اقدام کی اصل روح اور مقصد جلیلہ سے بھی آگاہ کیا جائے۔

د: اساتذہ کے ساتھ ساتھ ہر صوبے میں دوسرے صوبے کے طلبہ کو بھی داخلہ دیا جائے تا کہ نئی نسل ایک دوسرے کو سمجھ سکے اور تعمیر و تشکیل پاکستان میں معاون ثابت ہو۔

ر: لازمی اردو کے نصاب اختیاری کے موضوعات شامل کرنے کی بجائے نظریہ پاکستان، تاریخ پاکستان، مذہب، جغرافیہ اور صوبوں سے متعلق معلوماتی مضامین شامل کیے جائیں۔

س: نصاب میں پاکستانی کلچر، پاکستانی ثقافت، اسلامی تاریخ کے مضامین کا اجراء کیا جائے۔

ف: تمام پاکستانی زبانوں کو ترقی دینے کے اقدامات کئے جائیں تا کہ ان کے بولنے اور لکھنے والے احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

ک: ہمارے لکھنے پڑھنے والے سارتر، پابلو نودا اور ایلیٹ سے تو واقف ہیں مگر خوشحال خان خٹک، شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، بابا فرید سلطان باہو، شاہ حسین بلھے شاہ، خواجہ فرید اور جام درک سے محض واجبی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان مشاہیر کے بارے میں ہر سطح پر معلومات فراہم کی جائیں۔

ل: نیشنل بک کونسل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اکادمی ادبیات پاکستان، لوک ورثہ، مقتدرہ قومی زبان اور نیشنل سنٹر جیسے سرکاری ادارے قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے نہ صرف سیمینار کرائیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں ایسے موضوعات کا پرچار کریں جس سے ملک میں بسنے والے لوگوں میں اخوت، بھائی چارے، اتحاد اور یکجہتی کا رجحان پیدا ہو سکے۔

م: پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن اور ذرائع ابلاغ کے دوسرے سرکاری ادارے ایسے موضوعات پر فیچر، ڈرامے اور مذاکرات پیش کریں جن سے قومی یکجہتی کو فروغ ملے۔ علاوہ ازیں ایک صوبے کا سنٹر دوسرے صوبوں کے علاقائی پروگرام پیش کرے تا کہ عوام ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور اس طرح قومی شعور و آگہی پیدا ہو۔

ن: ایک صوبے کے لوگوں پر مشتمل وفد دوسرے صوبے کے مطالعاتی دورے پر بھیجا جائے اور اس کا مقصد محض اپنے "لوگوں" کو سیر نہ کرانا ہو بلکہ قومی یکجہتی کے سلسلے میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو۔

ہ: ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے قومی یکجہتی پیدا ہو خاص طور پر محلے دار ایسی ٹیمیں تشکیل دی جائیں اور ان میں ہر نقطہ نظر اور مکتبہ فکر کے لوگوں کو شامل کیا جائے جو گھر گھر جا کر اسے جذبے کا پرچار کریں تا کہ کم پڑھے لکھے اور ناخواندہ افراد کو بھی اس میں شریک کیا جا سکے اور انہیں آگاہی ہو سکے۔

ی: قومی زبان کے فروغ اور قومی یکجہتی کے لئے اردو دان طبقوں کو بھی اپنے رویوں میں لچک پیدا کرنی چاہیئے اور زبان و بیان کے سلسلے میں ایک نئی پاکستانی زبان کے امکانات کو قبول کر لینا چاہیئے۔

"قومی زبان اور قومی یکجہتی کے سلسلے میں جو معروضات پیش کی گئی ہیں اور جن پانچ عناصر کے حوالے سے بحث کی گئی ہے ان میں ایک چھٹے عنصر کا شامل کرنا امر لازمی ہو جاتا ہے اور یہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا عنصر یا طبقہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے قومی یکجہتی کے سلسلے میں اس طبقے کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے۔

> "قومی یکجہتی کی فضایوں تو متعدد عناصر سے قائم ہوتی ہے مگر اس سلسلے میں معاشرے کا سب سے موثر عنصر ہمارے شاعر، ادیب، دانشور، عالم، فلسفی اور صوفی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ سب تہذیبی کارکن ہیں اور تہذیب ذہنی کفیات کی شائستگی کا نام اور ذہن فکرگاہ بھی اور تخلیق گاہ بھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ حکمت عملی کی ٹیکنیکل وضاحتوں اور

اعداد و شمار کی باتیں نہیں کرتے ان کے بولوں کی اپیل براہ راست انسان کے پاکیزہ اور خوبصورت جذبات سے ہوتی ہے وہ دلوں کی بولی بولتے ہیں اور ان کی آواز تہذیبوں کی وسعتوں میں صویوں تک گونجتی رہتی ہے"

حقیقت بھی یہی ہے کہ ادیب اور شاعر لوگوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا پیغام محبت اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا ہے۔ دلوں سے کدورتیں اور نفرتیں مٹا کر ان میں اخوت کے گلاب کھلانا ہے۔ اس حوالے سے اس پر بڑی اور بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ پاکستان بھر میں بسنے والے گوں میں جذباتی اور روحانی ہم آہنگی پیدا کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ اس لئے بھی کہ وہ آخر کس کے لئے لکھتے ہیں اور کاغذ کالے کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ایسا تخلیقی عمل پیش کریں جو ملک وملت اور قوم کے مفاد میں ہو اور جس سے کھچاؤ، بیزاری اور دوری ختم ہو اور امن و آشتی اور قربت کا جذبہ پیدا ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو اردو زبان پاکستانی قومیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

حوالہ جات

1- برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء ص 100، محمد الیاس فارانی، ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی 1968ء

2- اردو ہندی تنازع: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص 9 نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔ 1977ء

3- اردو زبان۔ مسائل اور امکانات: سید شوکت علی شاہ، مجلس تقریبات ملی، ملتان، 1992ء

4- قائداعظم کی تقریریں: فیروز سنز لاہور

5- قائداعظم کی تقریریں: فیروز سنز لاہور

6- اخبار اردو۔ فروری 1983ء

7- اخبار اردو۔ اپریل 1982ء

8- تہذیب وفن، احمد ندیم قاسمی، پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور۔ 1975ء

شاہ لطیف بھٹائی کے نظری افکار

میرا محبوب ساون کی برسات کی طرح آیا
ان پر بارش ہوئی جو ساری زندگی یادِ یار کرتے رہے
گھٹا گھنگور چھائی پھر بادل برسے
بجلیاں چاروں اور کوندرہی ہیں
کچھ بادل استنبول کی طرف، کسی کا رخ مغرب کی طرف ہے
کچھ چین پر لہرا رہے ہیں کوئی سمرقند کی طرف رواں دواں ہیں
کچھ روم پر رقصاں ہیں کوئی کابل وقندہار کی طرف
کچھ دلی ودکن کی جانب اور کچھ گرنار کی طرف چھا رہے ہیں
کچھ جیسلمیر پر برس کر بیکانیر پر یلغار کر رہے ہیں
کچھ نے عمر کوٹ سے ہوتے ہوئے ولہار پر موسلا دھار بارش کی
اے میرے رب سندھ کو سدا شاداب رکھ
اے دوست! اے عزیز دلدار! سارے عالم کو آباد کر دے[1]

شاہ لطیف کے سُر سارنگ میں کہے ہوئے یہ بول اپنے باطن میں جو جمالیاتی حسن اور ظاہر میں جو دعائیہ فکر رکھتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں باقاعدہ طور پر شاہ لطیف کا طالب علم نہیں ہوں یہ الگ بات ہے کہ میں شاہ لطیف سے اسی طرح محبت اور عقیدت رکھتا ہوں جیسی حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ اور خواجہ فرید سے۔ ایک حساس آدمی کی حیثیت سے میں اللہ کے ہر بندے سے پیار کرتا ہوں اس لیے کہ شاہ لطیف بھی حساسیت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہوئے ہر انسان سے محبت

۱۔ پاکستان کے صوفی شعراء: اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۵ء ص ۲۹۳

کرتے ہیں اور عام لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں عام لوگوں کے جذبات و احساسات، ان کی مظلومیاں، ان کی بے چارگیاں، ان کی خواہشات، ان کی تمنائیں، ان کے خواب ان کے خیالات اور ان کی زندگی کے مشترکہ دکھوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ لطیف کے عہد میں عام لوگوں کی حالت بہت ابتر تھی وہ بدحالی کا شکار تھے۔ استحصالی قوتوں نے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور وہ ظلم کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے۔ اس پر وہ سراپا احتجاج بھی تھے اور نوحہ کناں بھی۔ وفورِ غم سے ان کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے۔ شاہ لطیف سے ان کا رونا اور ان کی بے بسی نہ دیکھی گئی اور لوگوں کا دکھ درد ان سے نہ دیکھا گیا اور یہ بات ان کے دل پر تیر کی طرح لگی۔ ایک درد مند دل رکھنے والے صوفی اور حساس شاعر ہونے کے ناطے وہ یہ برداشت نہ کر سکے کہ ان کے وسیب کا کوئی بندہ ظلم و تشدد کا شکار ہو اس لیے انہوں نے اپنے جاذو بھرے کلام کے ذریعے لوگوں کو جینے اور اپنے حقوق چھین لینے کے لیے تیار کیا اور ان میں یہ جذبہ بیدار کیا کہ وہ ظلم کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائیں بلکہ ان قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں۔ شاہ لطیف نے بے بس عوام کے دلوں میں ایک نئی روح ڈال دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ لطیف اور ان کا کلام عام لوگوں کے دل کی دھڑکن بن گیا اور وہ شاہ لطیف کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ پرستاری کی سبھی حدیں پار کر گئے۔ ہر لمحے اور ہر لحظہ ان کی زبانوں پر شاہ لطیف، شاہ لطیف نے نعرے گونجنے لگے۔ جو روحانی فیض شاہ لطیف نے عام لوگوں کو عطا کیا وہ آج بھی تازہ ہے اور اس کی خوشبو صرف سندھ میں نہیں بلکہ پوری دنیا اور اس کے ہر خطے میں پھیل گئی ہے اور وہ اس طرح کہ جیسے ساون کے بادل زمین کے ہر ٹکڑے پر برستے ہیں اور دھرتی کو آباد اور شاد کر دیتے ہیں شاہ لطیف نے بھی اپنی دھرتی کو اسی طرح اپنے کلام اور اس کے اثرات سے آباد و شاد کیا اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاہ لطیف کی جڑیں عوام میں تھیں۔ شاہ لطیف نے مقامی قصوں اور لوک داستانوں کے حوالے سے اپنے نظری افکار پیش کئے ہیں اور سُروں کے ذریعے اپنا پیغام اور اپنی بات لوگوں تک پہنچائی ہے اور لوگوں کی مہار اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ تلاشِ محبوب

اور تلاش حق کے لیے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اپنے من میں جھانک لینا چاہیے انسان کو جس کی تلاش ہے وہ تو اس کے من میں بستا ہے ہاں البتہ صادق جذبہ اور سچا پیار لازمی امر ہے۔ سسی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے سسی تو اپنے گھر کے کونے کونے میں تلاش کر
دور جا کے نہ بھٹک
تیرا دوست تو تیرے گھر میں موجود ہے

(سر سسی آبری) ص ۲۷۵[1]

جب عزرائیں نے سوئی ہوئی سسی کو جگایا
تو وہ یہ سمجھی
کہ کوئی پنوں کا قاصد آیا ہے
جب منکر نکیر کو سسی نے دیکھا
تو ان سے پنوں کا پوچھا
بھائیو! کیا یہاں سے میرے پیارے کا کارواں گزرا ہے

(سُر سسی آبری) ص ۲۷۷[2]

عقلمند آدمی ڈوبتے وقت جھاڑیوں کو پکڑتے ہیں
لطیف کہے جھاڑیوں میں کتنی شرم وحیا ہے
یا ساحل پر پہنچاتی ہیں
یا ان کے ساتھ خود ڈوب جاتی ہیں

(سُر سوہنی) ص ۲۷۳[3]

آنکھوں کی عجیب عادتیں ہیں
بزم محبوب سے میرے لیے دکھ درد لاتی ہیں

ا۔ پاکستان کے صوفی شعراء: اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد۔ ۱۹۹۵ء

ان سے عشق کرتی ہوں

جن کو قتل کرنے کے لیے تیغ وسناں کی ضرورت نہیں

(سُر آسا) ص ۲۹۷

کل تیرے ہم صفیر چلے گئے

پیاروں کے بغیر

جھیل میں رہ کر کیا کرے گی

دیکھو پرندے اپس میں مل جل کر کس طرح پیار اور محبت سے رہتے ہیں

مگر انسان نفاق وانتشار میں مبتلا ہے

کونج اپنے جھنڈ کے ساتھ رہنے کی عادی ہے

دوسرے پرندوں کے ساتھ دانہ نہیں چگتی

اپنے غول سے بچھڑ کر ساری رات

اپنے ہم صفیروں کو صدا دیتی رہتی ہے

(سُر ڈھر) ص ۳۰۱

شاہ لطیف کے یہ نظری افکار جوان کے بولوں کی شکل میں ہیں اپنے اندر حقیقت اور معرفت کا ایک فلسفیاتی نظام رکھتے ہیں اور ابن العربی کی طرح وحدت الوجود فکر کا پرچار کرتے ہیں آسمانوں تک پہنچنے کے باوجود بھی ان کا رشتہ اپنی دھرتی سے بہت زیادہ گہرا ہے اور مضبوط بھی۔ ڈاکٹر ایاز قادری کی یہ رائے بڑا وزن اور وزن رکھتی ہے کہ ''شاہ لطیف کا کلام اور پیام جہاں زندگی کا آئینہ ہے وہاں جام جہاں نما بھی ہے۔ یہ سندھ کی تمدنی، تہذیبی ثقافتی اور تاریخی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے''

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شاہ لطیف نے عوام سے ان کی زبان میں بات کی ہے اور ان کی بات کی ہے اور پھر ان کی جڑیں عوام میں ہیں اور انہوں نے سندھ کے لوگوں کو

جوعزم حوصلہ اور ہمت دی ہے اس کی بنا پر وہ سندھی عوام کے دل پسند، چہیتے اور رسیلے شاعر ہیں اور ہر شخص کی زبان پر ان کا نام ہے وہ بلاشبہ اپنے افکار کی بنا پر سندھ کا سنگھار ہیں اور ہم سب کے ماتھے کا جھومر ہیں اس حوالے سے ان کی آواز ہر عہد کی زندہ آواز ہے جو انہیں افاقیت کا درجہ عطا کرتی ہے۔ جب تک اس دھرتی پر ایک شخص بھی زندہ ہے شاہ لطیف زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ ان کا فکر ان کا فلسفہ، ان کی سوچ، ان کا خیال، ان کا رنگ اور ان کا انگ ان کے سُر ان کے بول ابدی اہمیت کے حامل ہیں۔ صوفی اور شاعر تو پیدا ہوتے رہیں گے مگر شاہ لطیف ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گا۔ عشق اور محبت کا جو فیضان شاہ لطیف نے ہمیں دیا ہے اس کا چشمہ جاری ہے اور اس سے سیراب ہونے کے لیے کوئی قید نہیں بس دل میں عشقِ حقیقی کی لہر جاری ہونی چاہیے اور یہ چشمہ ایک ایسے سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ شاہ لطیف بحرِ معرفت کا وہ پانی ہے جو سدا بہتا رہے گا۔ اس کا سفر جاری ہے اور جاری رہے گا اس لیے کہ عشق اور سچا عشق کبھی نہیں مرتا وہ تو ہمیشہ تابندہ رہتا ہے اس لیے شاہ لطیف فرماتے ہیں:

سر کو ڈھونڈھتا ہوں تو دھڑ نہیں ملتا
دھڑ ڈھونڈھتا ہوں تو سر نہ جانے کہاں ہے
ہاتھ اور انگلیاں اس طرح کٹ گئی ہیں جس طرح کوئی سرکنڈوں کو کاٹتا ہے
وحدت کی راہ جن کے لیے خوشی کا باعث بنی وہ اسی راہ کے قتیل ہوئے [1]

اور راہِ عشق میں قتیل ہونا شاہ لطیف کے نظری افکار کی بنیاد اور اساس ہے بعد میں آنے والے شاعروں نے بھی اور صوفیوں نے بھی ان کی آواز سے آواز ملائی ہے

خواجہ فرید نے بجا فرمایا ہے
تتی تھی جوگن چودھار پھراں
ہند سندھ پنجاب تے ماڑ پھراں

ا۔ وحدتِ افکار: وزارتِ اطلاعات ونشریات حکومتِ پاکستان اسلام آباد ص ۲۵۵

نُج بر تے شہر بزار پھراں
متاں یار ملیم کہیں سانگ سبب !!
متاں یار ملیم کہیں سانگ سبب !!
اور اِس آواز میں بھی شاہ لطیف کی گونج سنائی دیتی ہے

سچل سرمست .... محبتوں کا پیامبر

سچل سرمست کی شاعری فرید الدین عطار اور منصور حلاج کی فکری میراث کی آئینہ داری کرتی ہے تاہم ان کا کلام ان کے انفرادی نظریات و افکار کا منظر نامہ تشکیل دیتی ہے اور یوں ان کی ذات کی شعوری ندی کا بہاؤ انہیں ایک الگ تھلگ ساحلوں کا باسی بنا دیتی ہے جہاں مرشد کی بتائی اور سکھائی ہوئی راہِ سلوک کی باتیں اور گھاتیں ان کے فکری اظہار کو اور مہمیز عطا کرتی ہے۔

ہک ڈینہہ مینکوں مرشد اکھیا توں مے پیالہ پیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
آکھیس آپ سنجاون باجھوں ہمدم مول نہ تھیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
اپنی ذات لکا اتھ بیٹھیں تیڈا مطلب تھیسی کیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
موتو قبل ان تموتو اہی بچاون جیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
آکھیس ماریا حلاج نغارا سچل توں بھی ماریں تیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں

گویا اپنے آپ کو محبوب کی مرضی کے مطابق ڈھالنا عشق و محبت کی ریت بھی ہے اور روایت بھی عشقِ حقیقت ہے اور اگر اس کا مکمل طور پر ادراک ہو جائے تو پھر محبت کو پانے میں سر کی قربانی بھی دینا پڑے تو عاشق کا تو یہی نعرہ ہوتا ہے:

میں اکھ قلندر دھو کیتا

محبتوں کی باتیں اور اس کی کہانیاں بھی عجیب ہیں اور اس کے لیے جوگ اختیار

کرنا پڑتا ہے یوگی بن جانا اس کا طریق ہے گیروے لباس پہن کر جنگل جنگل بیلے بیلے اور صحرا صحرا پھرنا اس کا وطیرہ بن جاتا ہے اور پھر اپنا ہوش کہاں رہتا ہے کہ ہیئی گم تھیون مطلب والی صورتِ حال سامنے اتی ہے اور جیسا میں نیعرض کیا سر کی تو کوئی وقعت اور قیمت ہی نہیں رہتی اس تناظر میں بچل بھی پکار اٹھتے ہیں۔

یہ بازی سر کی بازی ہے
سر دینا سرافرازی ہے
یہی عشق کا عجز نیازی ہے

پھر شاہی عشق لگانا کیا اور اپنا آپ چھپانا کیا
سولی پہ پاؤں دھرتا نہیں تو دور خودی کو کرتا نہیں
اور موت سے پہلے مرتا نہیں
پھر عاشق نام کہلانا کیا اور نعرۂ حق لگانا کیا
جب پاؤں پیچھے دھرتا ہے
کب سر کا سودا کرتا ہے
اور موت سے بھی تو ڈرتا ہے
پھر عشق کی بات سنانا کیا در در آواز لگانا کیا
آ عشق کا خاص نشانہ بن
تو یک دل یار یگانہ بن
کُل دنیا سے بیگانہ بن
پھر خود سے خود شرمانا کیا اور عشق سے اب گھبرانا کیا
وہ کوچۂ عشق میں آیا ہے
اُس کیسا قدم اٹھایا ہے
اور سارا درشن پایا ہے
اب بچل سر کو بچانا کیا اور جی کر جان جلانا کیا

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سچل نے عشق و محبت کے فلسفے کا نچوڑ پیش کر دیا ہے اور یہی ان کا فکری منشور بھی ہے اور اسی پر ان کے عشق و محبت کے نظریات، احساسات مشاہدات اور تجربات کی بنیادی اساس استوار نظر آتی ہے اور اس میں جو گہرائی اور گیرائی ہے حلاجی فلسفے کے جو اسرار و رموز ہیں۔ موسیقی کے حوالے سے غنائیت اور نغمگی کی جو پُر اسرار فضا ہے۔ عشق کی گھاٹیوں سے اترنے اور محبت کی چٹانوں پر چڑھنے کا جو بیان ہے اور کوچۂ عشق میں قدم رکھنے کی جو ہدایت ہیں اور پھر درشن پانے کے بعد انعامات و اکرامات ہیں اور پھر اس میں جو لذت و طمانیت ہے جو خوشی اور سرخوشی ہے سرشاری کی جو کیفیات ہیں وہی اصل زندگی ہے اور یہی سچل کی شاعری کا ماحصل بھی ہے اور اس کے فکری اظہار کا نقطۂ عروج بھی...... اس لیے ان کا کہنا ہے:

محنت اور محبت ایک ہی شکل کے دو الفاظ ہیں
لیکن دونوں میں فرق ہے
وہی فرق جو دریا اور دریا کی موج میں ہوتا ہے

....

محبت کا پودا لگا کر نیاز و انکسار ے اس کی آبیاری کر
سوکھے درخت میں پھل نہیں لگتا
تو ہرے بھرے اور پھل دینے والے درخت کی طرح بن جا

....

اے عزیز! ربوبیت کے تصور میں
اپنے دل کو باغ بنا اور محبت کے پھل چن لے
اس باغ کی پرورش توحید کے پانی سے کر

....

محبت کا جذبہ میری رگ رگ میں موجزن ہے
مظلوموں کا درد و کرب میرا سرمایہ ہے

درد وگداز کا سمندر میرے سینے میں سمایا ہوا ہے

....

دل میں عشق ہے تو دل ہے
عشق نہ ہو تو فقط مٹی ہی مٹی
دو جہاں میں وہی بہرہ ور ہے
جو راہِ عشق سے نہیں ہٹتا
درد سرمایہ عشق ہے
اگر تو بے درد ہو تو تجھے مرد کہلانے کا حق نہیں
درد ہی باطنی فعالیت کا حاصل وصول
دردِ عشقِ الٰہی دردِ عشقِ رسول

....

دل کی کتاب کو درد بھری آنکھوں سے دیکھو
تمہارے روبرو جو سینکڑوں حجابات ہیں
یہ سب اٹھ جائیں گے

محبت اور عشق سے پیدا ہونے والے درد وغم اور سوز و گداز کے معاملات و معمولات کے سلسلے میں حکمت و دانش بھی جو باتیں سچل سائیں نے بیان کی ہیں وہ اپنے اندر بے پناہ جاذبیت بھی رکھتی ہیں اور حسن بھی۔ رعنائی فکر و خیال کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں اور باطنی فعالیت کی پاسداری بھی ۶ ان میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی عملداری بھی ہے اور حجابات اٹھانے کی طلب گاری بھی ...... اور اس سارے منظر نامے کو سچل کئی حوالوں سے بیان کرتے ہیں اور یہ تناظر لوک داستانوں کا ہے چنانچہ وہ عشق و محبت کے زندہ کرداروں کو اس کا محور قرار دیتے ہیں اور ہمیں درسِ محبت دیتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہی صوفیا کا طریق اور عشاق کا راستہ ہے اور سچل ہمیں اسی راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں

اس لیے کہ یہی راستہ راہِ حق کا ہے یہی راستہ عشق والوں کا ہے یہی راستہ اللہ اور اس کے بندوں سے محبت کرنے والوں کا ہے۔

لیلیٰ خاطر مجنوں ہویا عالم وچ اُرداسی
رانجھو تخت ہزاروں آیا کر کے دیس سناسی
بانہیاں دا بانہاں عشق کیتس سچل تہیں دے نیڑے نیئس

عشق کمایا ہیر تے رانجھے وچ آخیر زمانے
ہوسن وچ کتاباں انہاں سچل بہوں بیانے

لوک داستانوں کے کرداروں کی زندہ جاوید محبتوں اور چاہتوں کا حوالہ سچل کی شاعری میں جا بجا بکھرا نظر آتا ہے تاہم اس کا ایک مربوطی نظام ہے جو کئی زاویوں اور ان گنت گوشوں سے داستانِ عشق سناتا ہے اس لیے ڈاکٹر غلام علی الانا* نے لکھا ہے ''سچل سائیں نے لوک ادب کے عوامی کرداروں مثلاً سسی، مارئی، نوری، لیلیٰ، سوہنی اور مومل کے روپ میں حقیقی محبوب و مطلوب سے محبت، پیار، امنگ، جذب و کیف اور سوز و سرور کا اظہار کیا ہے'' اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب یہ جیتے جاگتے کردار محبتوں کے مرقعوں کی شکل میں بطور مثال ہمارے سامنے آتے ہیں تو ایک نیا جہان آباد ہو جاتا ہے جہاں ہیر رانجھے کے فراق میں اشکوں کا تلاطم برپا کیے نظر آتی ہے جہاں سسی پنوں کی جدائی میں درد کی تانیں اور غم واندوہ کی لے تخلیق کرتی دکھائی دیتی ہے اور یوں درد و جدائی کے نغموں کا ایک ایسا لازوال اور آفاقی صحیفہ وجود میں آتا ہے جو محبتوں کی انمٹ یادوں کے دریچے کھول دیتا ہے۔ محبت میں دھڑکنے والے دلوں کی خوشبو ماحول کو عطر آگیں کر دیتی ہے اور ہم ایک اور ہی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور سچل کے یہ سچے بول ہماری سماعتوں سے ٹکرا کر ہمیں مسحور کر دیتے ہیں:

سدا رہیں خوشحال
مارو دیس ملیر میں
کوئی دکھ ملال

آئے نہ ان کے جیون میں

مولا آج تو جل تھل کر دے
اس برہن کا دیس
آن ملے گا برکھا رت میں
پیتم ہے پردیس

اک تجھ کو میں ہوت نہ بھولوں
بھولے سب سنسار
موت سمے بھی آنکھوں میں
تو سدا بسے دلدار

ملک ملیر کی سمت سے آج
ایسی چلی ہوا
جیسے قاصد لینے آیا
میں نے یہ سمجھا

سچل سائیں کے اس شعری اظہار میں ہجر و فراق کی جو کیفیات عکس ریز ہیں اور دعاؤں کی جو ریکھائیں ہیں اور خواہشوں کی جو برساتیں ہیں اور میل ملاپ کی جو تمنائیں ہیں وہ اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتیں اور سچل کا یہ فرمان سونے میں جڑنے اور موتیوں سے لکھنے کے قابل ہے:

میل ملاپ سے رہنے میں راحت ہے
شہد کی مکھیاں مل جل کر کوشش کرتی ہیں
تب ہی شہد پیدا ہوتا ہے

سچل کی شاعری اور ان کے الہامی کلام کا مطالعہ قوسِ قزح کے سبھی رنگ دکھاتا

ہے اور اس میں زندگی کا رنگ نمایاں ہے اس لیے پروفیسر کرار حسین کی یہ بات سو فیصد سچ بلکہ سچو سچ ہے کہ ''سچل سرمست کی شاعری اور اس کی عزارت ان کے ہر ایک مصرعے اور ہر مصرعے کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک لفظ کے ہر ہر حرف میں پوری توانائی کے ساتھ دوڑتی نظر آتی ہے اور اس میں درد و غم اور محبت کا عنصر نمایاں ہے اور اسی میں درد کا خمار اور زندگی کا نکھار ہے اور میرے نزدیک غم ہی اصل حقیقت ہے۔ سچل سائیں کے بقول

غم کھاری پانی والے سمندر کی طرح ہے
وہ سمندر جس سے قیمتی موتی نکلتے ہیں

اور

خوشی میٹھے پانی کا دریا جس سے مچھلیاں نکلتی ہیں

مگر خوشی کے میٹھے پانی کے دریا سے مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے غموں کے کھارے پانیوں سے گزرنا پڑتا ہے اس خیال کے ساتھ کہ اس کے حصول کی کوشش ہی زندگی سے عبارت ہے راہِ محبت میں قربانیاں دینے، عشق و محبت میں سلگنے اور سلگتے رہنے میں جو لطف ہے اور فراق میں جو لذت ہے وہ وصال میں کہاں ...... اور یہی وہ درسِ محبت ہے جو سچل سائیں ۱۷۵ سال گزرنے کے بعد بھی دے رہے ہیں اور محبتوں کے اس عظیم پیامبر کے اقوال آج بھی تابناک ستارے کی طرح آسمانِ تصوف پر جگمگا رہے ہیں اور ان کا ابدی پیغام یہی ہے

جیون دُکھ کے سنگ بسر کر
جب تک جینا ہے
پریتم سے جو بول ندھا ہے
اُس کو پانی دے

اور اسی پیغام کو خواجہ فرید نے یوں آگے بڑھایا ہے:

ہُن تھی فریدا شاد دل
مونجھاں کوں نہ کریاد دل
جھوکاں تھیسن آباد دل
ایہا نیں نہ دہسی ہک منڑیں

سچل سرمست کی شاعری کے موضوعات

مجھے اپنی بات اس اعتراف کے ساتھ شروع کرنا ہے کہ میں نے سچل سرمست کے بارے میں وہ سب کچھ نہیں پڑھا جو سندھی زبان میں شائع ہوا ہے البتہ جو کچھ اردو میں انکے حوالے سے شائع ہوتا رہا ہے وہ میری نظر سے ضرور گزرا ہے۔ البتہ میں نے سچل سرمست کی سرائیکی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اور اس تناظر میں' میں سچل کی شاعری کا موضوعاتی منظر نامہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ یہاں جو دانشور' اہل ذوق اور سچل کے مداحین تشریف فرما ہیں وہ مجھ سے کہیں بہتر سچل کی شاعری کو جانتے بھی ہیں اور اسے سمجھتے بھی ہیں۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے بھی اپنی بساط بھر سچل کے شعری اور فکری نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور میرا مقصد بھی یہی ہے کہ اس میں آپ کو بھی شریک کر لوں۔

میں نہ تو صوفی ہوں اور نہ ہی صوفیانہ تجربات سے گزرا ہوں تاہم صوفیاء اور خاص طور پر ان کی شعری تخلیقات سے مجھے عقیدت ضرور ہے۔ جگر نے کہا تھا

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ظاہر ہے کہ یہ بات بھی تو صوفیاء کا فیض ہے اس لئے کہ صوفیاء کے افکار ان کی شاعری' ان کے ملفوظات' ان کے فرمودات عشق اور محبت کے خمیر سے اٹھتے ہیں۔ وہ محبت کا درس دیتے ہیں وہ انسان سے نفرت کرنا نہیں سکھاتے وہ چونکہ خود ایک میں ایک ہو جانے کے متلاشی ہوتے ہیں اس لئے سب کو ایک ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر صوفی کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے اور اپنا ایک عقیدہ ہوتا ہے اور اس طریقے اور عقیدے کی بدولت وہ اپنی الگ پہچان کراتا ہے اور کسی نہ کسی حوالے سے اس کی اپنی شناخت بنتی ہے' البتہ ہر صوفی کے فکری دھارے ایک نقطے پر

ہی آکر ختم ہوتے ہیں اور یوں ایک اکائی کی صورت سامنے آتی ہے۔ سچل سرمست کے ہاں بھی اپنا ایک فکری نظام ہے جو فلسفہ وحدت الوجود کے گرد گھومتا ہے اس طرح وہ منصور کی انا الحق کی روایت کے نہ صرف پیروکار ہیں بلکہ اس کے داعی اور مبلغ بھی ہیں۔ سچل سرمست کو یہ صوفیانہ روایت ایک اعتبار سے ورثے میں ملی ہے۔ اگر ہم وادی سندھ کی صوفیانہ شاعری پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو مربوط بھی ہے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی۔ شاہ حسین(۱۵۳۹ء تا ۱۵۹۳ء)' سلطان باہو(۱۶۲۸ء تا ۱۶۹۱ء)' بلھے شاہ(۱۶۸۰ء تا ۱۷۵۸ء)' شاہ لطیف بھٹائی(۱۶۹۰ء تا ۱۷۵۲ء)' علی حیدر(۱۶۹۰ء تا ۱۷۸۵ء)' وارث شاہ(۱۷۲۲ء تا ۱۷۹۸ء) اور سچل سرمست (۱۷۳۹ء تا ۱۸۲۹ء) میں ان صوفی شاعروں کے مسالک کی تفصیل میں نہیں جاتا اور نہ ہی اس کا موقع ہے' تاہم تصوف اور اس کے مضامین و موضوعات کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب تسبیح کے دانے ہیں جو ایک رشتے میں پروئے ہوئے ہیں اور ان سب کا مقصد تلاش حق ہے۔ اپنی اس بات کی وضاحت کے لئے مثالیں ملاحظہ کیجئے:

ربا میرے حال دا محرم توں
اندر توں ہیں باہر توں ہیں روم روم وچ توں
توں ہیں تانا توں ہیں بانا سب کچھ میرا توں
کہے حسین فقیر نمانا میں ناہیں سب توں

(شاہ حسین)

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیس ہر رنگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو جیں اے بوٹی لائی ہو

الف احد جد دتی دکھالی از خود ہویا فانی ہو
قرب وصال مقام نہ منزل نہ اتھ جسم نہ جانی ہو

نہ اتھ عشق محبت کائی نہ اتھ کون مکانی ہو
عینوں عین تھیوے باہو سر وحدت سبحانی ہو

(سلطان باہو)

الف اللہ نال رتا دل میرا
مینوں ب دی خبر نہ کائی
ب پڑھدیاں مینوں سمجھ نہ آوے
لذت الف دی آئی
ع تے غ نوں سمجھ نہ جاناں
گل الف سمجھائی
بلھیا قول الف دے پورے
جیہڑے دل دی کرن صفائی

(بلھے شاہ)

قصر ہے ایک اور در لاکھوں
ہر طرف بے شمار ہیں روزن
مجھ کو ہر سمت سے نظر آیا
جلوہ گر ایک ہی رخ روشن

(شاہ عبد اللطیف ترجمہ شیخ ایاز)

ہک ڈیہاڑے مینوں آپ اینویں فرمایا
ایہو طریقہ وحدت والا ساتوں بہوں خوش آیا
سچل گالہ عشق دی سچی بیا سمجھ پندھ اجایا

(سچل سرمست)

میں نے ابھی جس مربوط فکری نظام اور مضبوط رشتے کی بات کی تھی اس کا

اندازہ آپ نے مثالوں سے لگایا ہو گا کہ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے اور بات سے بات نکلتی جاتی ہے۔ تاہم بات کرنے اور بات کہنے اور پھر بات سمجھانے کا اپنا ایک رنگ اور اپنا ایک ڈھنگ ہے اور بچل کے ہاں بھی اس کا اپنا طریق کار ہے اپنا اسلوب ہے اور بات کرنے کا اپنا ایک سلیقہ ہے، البتہ سلسلہ وہیں جا کر جڑتا ہے جو فلسفہ وحدت الوجود کی بنیاد ہے اور اس کے مثلث کی طرح تین زاویئے بنتے ہیں یعنی عشق مرشد، عشق رسول، عشق خدا۔

درحقیقت مقصد ایک میں ایک ہونا ہی ہے اور اس کے لئے وسیلے اور راستے کی ضرورت پڑتی ہے جو یقینی طور پر مرشد اور رسول سے ہی ہو کر جاتا ہے۔ اور اس کے لئے کئی حوالوں سے بات سامنے آتی ہے اور یہ سب کچھ ایک لمحے یا ایک پل میں نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے پس منظر میں برسوں کی ریاضت اور فکر کار فرما ہوتی ہے اور تب وہ منزل آتی ہے جب بچل خود کہتے ہیں:

"یہ کوئی معمولی کلام نہیں یہ مکمل طور پر اللہ کی تعریف اور توصیف ہے۔ ان اشعار میں قرآن پاک کا مفہوم بھی ہے اور نبی پاک کی احادیث بھی موجود ہیں۔"

گویا بچل سرمست کا فکری نظام قرآن پاک کے فکری نظام کی تشریح و توضیح ہے، اسی طرح بچل نے اپنی شاعری کو تبلیغ حق اور تصوف کے فروغ کا وسیلہ بنایا اس ساری صورت حال میں سب سے بڑا حوالہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی پس منظر کا بھی ہے اور اس کے لئے یقینی طور پر اس عہد کی تصویر بھی سامنے رکھنا ہو گی جو کسی حوالے سے بھی خوشگوار نہیں ہے بلکہ ابتری اور بدحالی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ خاص طور پر سندھ جس افراتفری، ظلم و تشدد اور استحصال کا شکار تھا وہ بچل کے سامنے تھا۔ بچل نے کلہوڑوں کے عہد میں آنکھ کھولی، پھر تالپوروں کا زمانہ دیکھا اور پھر انگریزوں کے حاوی ہو جانے کا دکھ بھی سہا۔ اس سارے عہد میں سیاسی خلفشار برقرار رہا۔

بچل نے ان سب کا مشاہدہ کیا اور پھر ان حالات میں رہ کر نعرہ منصور بلند کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ نفسا نفسی، آپا دھاپی، لالچ اور لوبھ، معاشی بدحالی اور مذہبی تنگ نظری کے اس عہد میں بچل نے محبت، اخوت اور پیار کے گیت گائے۔ انگریزوں کے سندھ میں قدم جمانے کے خطرے کا احساس کرتے ہوئے بچل نے جس طرح اپنی

قوم کی رہنمائی کی اور جس طرح انہیں خبردار کیا اسے ایک اعتبار سے مزاحمتی شاعری اور اجتماعی شاعری کا باب اول قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے بقول:

"ایسا نہ ہو کہ سورج ڈوب جائے اور دیر ہو جائے اور چاروں طرف اندھیرے بکھر جائیں اور ان اندھیروں سے فائدہ اٹھا کر فرنگی تم سے تمہاری عظمت چھین لیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر تمہاری لاشیں پہاڑوں پر بکھری ہوئی ملیں گی۔ وہ مکار اور چالباز لوگ ہیں ان کے ذہنوں میں پہلے ہی ملک گیری کی ہوس ہے اور اس کا جنون سوار ہے اور وہ تمہاری بربادیوں کے لئے چال سوچ رہے ہیں۔ ابھی بھی وقت ہے ایک ہو جاؤ اور یک مشت ہو کر فرنگیوں سے نبٹو۔ دیر مت لگاؤ اور ایسا وقت نہ آنے دو۔"

سچل سرمست نے اپنی شاعری میں اس کا کھل کر اظہار کیا ہے:

ھک ڈینہ میکوں مرشد آکھیا توں ے پیالہ پیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
اکھیں آپ سنجاݨ باجھوں ہم دم مول نہ تھیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
اپنی ذات لکا اتھ بیٹھیں تیڈا مطلب تھیسی کیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں
موتوا تمل ان تموتوا ہی پچھلوں جیویں
اکھیم اینویں سائیں اینویں
آکھیں ماریا حلاج مخارا سچل توں بھی ماریں تیویں
آکھیم اینویں سائیں اینویں

مرشد کے حکم کی تعمیل کا واضح منظر نامہ سچل کی ساری سرائیکی شاعری میں تشکیل پاتا ہے اور اس طرح سوز و گداز' جذب و کیف' مستی و سرمستی کے ساتھ ساتھ نفی اثبات فنا بقا' ذکر و فکر' حال و قال' ہمہ اوست اور وحدت الوجود جیسے مسائل کی تشریح و توضیح بھی سامنے آجاتی ہے۔ اور سچل پتے کی بات کہہ جاتے ہیں:

سجھ کڈا ہیں مول نہ ڈیکھے پاک پلیتیاں جائیں
ہر ھک جاہ پر تو تمیں دا تیکوں آکھ سنائیں
بچل ہر کہیں شے وچ ایویں سیر کریندا سائیں

حسن ازل اور حسن حقیقی کی تلاش صوفیاء کا مسلک اور ان کے فکر کا محور ہے اور وہ کائنات کی ہر شے میں حسن حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ بچل کے ہاں بھی حسن و عشق کے بیان کی یہ لہر ایک صوری اور معنوی نظام کے تحت رواں دواں دکھائی دیتی ہے اور اس کا مطالعہ بچل کے گہرے مشاہدے اور حسن سے ان کی گہری وابستگی کا آئینہ دار ہوتے ہوئے ان کے جمالیاتی شعور کی نشاندہی کرتا ہے۔ ٹیگور نے اپنی نظم "تازہ حسن کا گیت" میں لکھا ہے:

"ہم اپنے راستے پر کھڑے ایک ایک لمحہ شمار کر رہے تھے حتیٰ کہ بہار کی صبح کو تم جلوہ گر ہوئیں۔ تمہارا آنا ایسا تھا جیسے کسی سپاہی کو موت کے دروازے پر زندگی واپس مل جائے۔

"ہم اپنے راستے پر کھڑے ایک ایک لمحہ شمار کر رہے تھے
حتیٰ کہ بہار کی صبح کو تم جلوہ گر ہوئیں۔ تمہارا آنا ایسا تھا
جیسے کسی سپاہی کو موت کے دروازے پر زندگی واپس مل جائے
اف تیرے حسن کی بہار
ہم تیری جوان آواز کی موسیقی تعجب سے سن رہے تھے
تمہارا لباس ہوا میں بہار کے پھولوں میں منتشر خوشبو سے اڑا جا رہا تھا
تمہاری زلفوں میں مالتی کے سفید پھول ایسے چمکتے تھے جیسے ستاروں کا جھرمٹ
تمہارے تبسم کے پردے میں برق چمکتی ہے
اف تیرے حسن کی بہار
اور کون جانے تیرے تیر کہاں پوشیدہ ہیں جو قتل کرتے ہیں۔"

حسن تازہ کا یہ احساس ہر بڑے شاعر کے ہاں موجود ہے جو اس کے بے پناہ مشاہدے گہرے شعور حسن اور اس کے ذاتی اسلوب سے ابھرتا ہے اور اس کے من میں پوشیدہ عشق کی لہروں سے پھوٹتا ہے۔ اس میں خاص بات اپنے وسیب کا حوالہ ہے اور اس

میں اپنے وسیب کی روایت ہر حوالے سے موجود ہوتی ہے۔ بچل کی شاعری میں بھی یہ روایت ایک نئی نویلی دنیا آباد کرتی دکھائی دیتی ہے جس میں حسن کی بے پناہ رعنائیاں الگ الگ زاویوں، پیرایوں، شکلوں، صورتوں اور منظروں سے جھلکتی، چمکتی اور جھمکتی نظر آتی ہیں۔ بچل کا ایک اپنا لینڈ سکوپ ہے جس کے گرد انہوں نے حسن و عشق کے موضوعات کی فصیل کھڑی کی ہے اور اس فصیل کے گرداگرد پیار اور محبت کی دھرتی میں جلال و جمال کی ایسی خوش رنگ فصلیں لگائی ہیں کہ جن میں علائیم و رموز کے خوشنما پودے اور تشبیہات و استعارات کی خوش رنگ بیلیں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ خاص حوالہ یہ ہے کہ اس میں بچل نے سندھی تہذیب و تمدن اور کلچر کو محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ داد بوھیو رقمطراز ہیں:

"ہر زبان کا عظیم ادب لوگوں کے ثقافتی مواد پر مبنی ہوتا ہے۔ سندھی ادب کی مختلف اصناف میں سندھ کی ثقافت کو محفوظ رکھنے کی روایت بھی شروع ہوئی۔ سندھی ادب کی اصناف گنان وائی، بیت، کافی، دوھا اور لوک ادب کی صنفوں میں سندھ کی ثقافتی روایت کو محفوظ کیا گیا ہے شاہ کریم، شاہ لطیف اور بچل کا کلام سندھی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔"

جہاں تک بچل کے کلام کا تعلق ہے انہوں نے اپنی کافیوں اور دوھڑوں میں خاص طور پر یہ اہتمام کیا ہے اور لوک کہانیوں میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، عمر ماروی، مومل رانو اور نوری جام تماچی کی تلمیحات استعمال کی ہیں۔ لوک داستانوں کے یہ حوالے انہیں بقول دلشاد کلانچوی "ایک وسیس شاعر بنا دیتے ہیں اور پھر انہوں نے ایک بڑا کام اس سلسلے میں یہ کیا کہ لوک داستانوں کے حوالے سے خالق حقیقی کے اسرار و رموز بتائے اور اس اچھے انداز میں بتائے کہ جنہیں سن کر لوگ سکون محسوس کرتے تھے۔"

بچل کے ہاں حسن کے بیان میں سراپا نگاری کو بڑا دخل ہے جو بچل کے وسیع مشاہدے اور باطنی کیفیات کا غماز ہے۔ بچل جب محبوب کے حسن کا نظارہ کرتا ہے تو سب سے پہلے آنکھیں آتی ہیں جو چار ہو جائیں تو دل کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چشم غزال اور چشم نرگس تو ایک طرح گھسی پٹی تشبیہیں ہیں۔ بچل فطرت کے دوسرے مظاہر سے نئی تشبیہیں تراشتے ہیں ان کے ذوق جستجو اور قوت مشاہدہ کا کمال یہ ہے کہ محبوب کی آنکھوں کی تعریف و توصیف میں جتنے بھی دوھڑے لکھے ہیں کہیں پر بھی اپنے آپ کو نہیں دہرایا۔

ہر دوھڑے میں نیا انداز' نیا روپ' نیا موضوع' نئی تشبیہ اور نیا منظر نامہ ہے اور یہ چگل کی تخلیقی توانائی کا مظہر ہے:

اکھیاں باز عقاب سوہنے دیاں کون پروں پرواز وڈے
اگوں انہاں مشتاقاں دے ہوندے سو سو نیاز وڈے
باجھاں بدھ گمت گل وچ گاری کردے اے ایلاز وڈے
تاں بھی چگل معشوقاں دے ہوَن غمزے ناز وڈے
شیر اکھیں شہ زور سوہنے دیاں برچھیاں یا تلواراں
حاکم تخت حکومت والیاں سائیں آپ سنواریاں
مارن ملک ویس دا یارو قابض رہن قراریاں
کتلیاں میں بادشاہیاں ڈٹھیاں چگل انہاں اڈاریاں

شیر اکھیں دے غالب ہوندے اتے شیر جنگل دے
شیر اکھیں تو کوئی نہ بچی آس وچ جنگل دے
جھنگ والا مڑ ویندا ایہہ کھڑا واکن قتل دے
مارن باجھوں مشتاقاںدے چگل مول نہ ٹل دے

محبوب کی آنکھوں کی تعریف کے ان مختلف زاویوں سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چگل کو اظہار بیان پر کتنی قدرت حاصل ہے وہاں متنوع موضوعات کا بھی علم ہوتا ہے۔ عشق و محبت میں آنکھیں جو کردار ادا کرتی ہیں وہی دراصل عشق کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ اس پس منظر میں دنیائے عشق میں آنکھوں کی بڑی اہمیت ہے۔ چگل نے آنکھوں کو ہی عشق کہہ کر ایک طرف تو اپنے نظریہ عشق کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف نظریہ حسن کی بھی وضاحت کی ہے اور وہ یوں کہ جو شراب دید پی لیتا ہے وہ حسن کے چنگل میں پھنس جاتا ہے اور عشق سے فرار کی کوئی صورت بھی نہیں مل سکتی' دیکھئے:

اکھیاں عشق تے عشق نی ابرو مژگاں عشق سموئی
جادوگر دا جادو ڈاڈھا سمجھ نوں حیرت ہوئی

عاشق دیکھ حسن دے سوچے حال ونجیدا اوئی
سچل تیر کماناں نازاں بھیج نہ ڈیندا کوئی

اس دوھڑے میں سچل نے تشبیہات کا کمال دکھایا ہے۔ آنکھوں کو عشق، عشق کو ابرو اور مژگان کہنا اور پھر آنکھوں کو جلوو سے تشبیہ دینا۔ یہی نہیں بلکہ ابرو کو تیر کمان کہنا اور اس طرح ان کے نشانے خطا نہ ہونے کا ذکر کرنا سچل کی اظہار بیان پر قدرت کی دلیل روشن ہے۔ سچل کی جس سراپا نگاری کے کمال کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اس میں چہرہ، چال، زلف اور لباس بھی شامل ہے۔ ان سب میں جو صوتی آہنگ ہے اس نے اثریت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ سرائیکی الفاظ کا بانکپن اور شیرینی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی اور جو چاشنی سچل کے کلام میں پیدا ہوئی ہے اس کا ذائقہ دائمی ہے۔ اس لذت آگیں اور لطافت آمیز دائمی لذتوں کے نمونے دیکھیے۔ سچل چہرے کا بیان کرتے ہیں:

چمکن چھلکن جھمکن رخ تے واہ موتی دے دانے
ساگر صورت حق دی ڈیکھو جے کوئی آن سنجانے
جھلکن جو جبیں تے جلوو و یار سوھنے کون بھانے
سچل قدر انہاں دا جاناں یاوت آپ او جانے

زلفوں کا بیان دیکھیے:

دل دل تے سو سو چھلے پھاسیاں جوڑ کھڑائیں
سحر جادو منڈ ڈیکھ انہاں تے طرحیں طرح پڑھائیں
عاشقاں دیاں کر دیں دوانیاں حکماں حکم پھالیں
بھجے سچل عاشق کیویں حسن دی فوج چڑھا لیں

محبوب کے لبوں کی تعریف اور مسکراہٹ نئے انداز میں ملاحظہ کیجیے:

سونہڑا یار ہمیشہ ساڈے نال بھی کھلدا ہسدا
ھک دم دور نہ تھیوے ساتھوں وچ اکھیندے وسدا
بیا کوئی کم نہ جانے ہرگز کھل کھل وا‌لڑی کھسدا
نہیں نباہ اساں نال سچل گالھا ہائی ڈسدا

چال کا بیان دیکھیے جس میں زلفوں کے لٹکنے کا بھی ذکر آیا ہے:

سوہنا ناز غماز سیتس وہ چال عجائب تجلے
کون دلبر جو ہووے اٹھل تب حسن دی جھلے
وال وٹھیل کا رہو کالے دل دل چھلے چھلے
روز ازل کنوں یا بچل میں پیشم انہاں دے پلے

اسی طرح لباس کی خوبصورتی کے بیان کے ساتھ حسن کی دیگر کیفیات کا اظہار دیکھیے:

لعل یاقوتاں کون شرماوے نرم لباس دی لالی
سرخی سوہنے واہ جو لائی لوڑھے منصب عالی
لالے داغ رکھیا دل اتے ڈیکھ کے حسن دی چالی
سوکن نال جو محکم کتیں بچل مست موالی

حسن کے مختلف زاویوں کی یہ عکاسی جو رومانی فضا تخلیق کرتی ہے۔ وہ دوسرے شعراء خاص طور پر خواجہ فرید کے برعکس بچل کے من سے پھوٹتی ہے اور یوں بچل اپنی داخلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں۔ باطنی جذبات و احساسات کا یہ بیان سچا بھی ہے اور کھرا بھی۔ اس میں کسی قسم کی لگی لپٹی نہیں بلکہ صاف و شفاف ندی کا پاکیزہ بہاؤ ہے' جس کی تصویر دل کے کنویں پر عکس ریز ہے اور اس میں لفظوں کے رنگوں سے میناکاری کی گئی ہے۔ بچل کے ہاں خالصتاً" انسانی حسن کی عکاسی نظر آتی ہے' البتہ کہیں کہیں حسن حقیقی کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کی یہ ترجمانی بچل نے اپنے دھڑکتے دل کی دھمال سے کی ہے' جس میں ہجر و وصال کی ملی جلی کیفیات جلوہ ریز ہیں۔ وصال حسن میسر آجاتا ہے تو خوشی و مسرت کی ابدی لہریں موجزن ہو جاتی ہیں:

اپنا وعدہ آپ پلیو نے اساں تاں درشن پایا
وسر گیو سے فلک ہجر دا گل سجن چا لایا
معاف مدایاں سمہ کتو نے. یار ساکوں پر چایا
آگن میڈے ٹر آیا سویلے مولی عجب محب ملایا

سچل جنہیں واسگ ہے اصلوں سر میڈے اوندا سایا

یہاں سچل شیلے کا ہم زبان ہو جاتا ہے جو اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:

"چشمے دریا سے ملتے ہیں اور دریا سمندر سے' جنت کی ہوائیں ہمیشہ شیریں جذبات سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ دنیا میں کوئی تنہا نہیں ہے۔ تمام چیزیں ایک قانون کی رو سے غیر قانونی ہیں۔ ایک دوسرے سے مل کر..... پھر کیوں نہ میں تجھ سے مل جاؤں۔"

مگر وصال تو پلک جھپکتے لمحوں کی بات ہے اور پھر سچل کے اپنے بقول ہجر کے فلک سر پر چھا جاتے ہیں۔ حسن کی تلاش اور اسے پانے کی خواہش دکھوں کی دھاں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور شاعر کے دل سے کوک نکلتی ہے۔ سچل کے ہاں اس تجربے کا اظہار بھی دھاں اور کوک کی شکل میں ہوا ہے' دیکھئے:

کینوں کوکاں کینوں آکھاں ہجو نال مار یوئی

ڈکھ ڈراپے تیکوں ڈیساں جو دم نال گزر ہوئی

ایک کافی میں ہجر کا بیان دیکھئے:

یار دے پاروں آئے ماکوں

ڈاڈھے ڈور دور ایسے

انہاں عتاباں سنوڑی سیاں

عشق دے مچ مچائے

خاطر دے ہتھوں آکھ متوانے

جیں سمہ حال سنائے

نال سُشن دے مونجھ گیو سے

برھے بو بجھائے

آھیں ڈھاڈے سچل بچارے

انگ بھبھوت رمائے

دل تو ساڈے وسو نہ وینہ

ہجر دے وچ جو حال تھیا

سو سو طعنے لکھ لکھ بیدیاں
کرواس سار لوک گلہ

ہجر و وصال کی اس رومان پرور فضا میں سچل کا عشق پروان چڑھتا ہے۔ ہجر و وصال کی ان کیفیات کا بیان ان کی کافیوں میں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ہیر رانجھے کی داستان بیان کرتے ہوئے بھی یہی رومانی فضا قائم ہے اور یہاں بھی سچل کا دل مسرتوں کے گلاب بھی کھلاتا ہے اور درد و فراق کے گیت بھی گاتا ہے۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں عشق و محبت کی دھیمی آنچ ہے جو سرور پیدا کرتی ہے' اس لئے کہ بھڑک کر جل جانے میں وہ مزہ نہیں جو سلگتے رہنے میں ہے۔ سچل کی شاعری کا یہی سلگاؤ اسلوب و بیان کے حوالے سے اپنے تجربے میں پڑھنے والے یا سننے والے کو شریک کر لیتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آفاقی شاعری اسی کا نام ہے۔ داغستان کے شاعر رسول حمزہ نے صحیح کہا ہے:

"شاعر کو قلم صرف دل کے درد اپنے احساس مسرت کے تقاضے پر ہی اٹھانا چاہیے۔ وہ ہنستا ہے اس لئے نہیں کہ دوسرے ہنستے ہیں۔ رنگ و محفل دیکھ کر وہ اداس ہوتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ دوسروں کے غم میں شریک ہونے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ نہیں' یہ وہ ہے جو نشاط و طرب کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جب وہ ہنسے تو دوسروں کو شادمانی کا اظہار کرنا چاہیے' جب شاعر اپنے دل کے درد کا اظہار کرے تو دوسروں کو بھی اپنے دل ڈوبتے ہوئے محسوس ہونے چاہئیں۔"

اس میں شاعر نے ایک طرح شعری منشور بھی بیان کر دیا ہے اور جب وصل کی گھڑیوں سے بہرہ ور ہوتا ہے تو فرحت و انبساط کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔

وہ ازل سے حسن کا متلاشی ہے اور رومان کی راہوں پر چلتا ہوا اپنے منشور عشق کا اعلان کرتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے:

سوہنا یار خراماں آیا ناز غرور غماز کنوں
لک کھڑے شہباز تے شکرے چشماندے پرواز کنوں
وحشت بھل نہ سگی بازاں جیب کھڑے آواز کنوں
عشق دی آیت عشق پڑہی مشتاقاں حسن والی ایس بیاض کنوں

حسن کی بیاض سے آیات عشق پڑھنے والا شاعر سچل انسان، کائنات، حسن ازلی اور لافانی حسن کی محبت کے گیت گاتا ہوا گوئٹے کے اس کہے کی صداقت بن جاتا ہے:

"اب ہر کوئی سرگرم جستجو ہے، اپنے اپنے حبیب کی جستجو میں گرم جذبے اور نظارے ایک زندگی بے کراں کی طرف گامزن ہیں۔"

یوں سچل حسن اور بیان حسن کے حوالے سے آفاقیت کا حامل شاعر ہے اور اس کی خوشبو سے سندھ کے میدان اور کھلیان ہی نہیں اس دھرتی کا ذرہ ذرہ مہکا ہوا ہے اور اس کی یہ آواز سب کی سانجھی آواز بن جاتی ہے:

آجا میرے پاس اے ساجن
آجا میرے پاس

حسن و عشق کے بیان کی جو تفصیل ابھی بیان کی گئی ہے اس سے سچل کے زور بیان اور قدرت کلام کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور کہیں کہیں لوک داستانوں کے حوالے بھی آجاتے ہیں اور ان سب میں داستان ہیر رانجھا کا حوالہ خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور بقول ڈاکٹر شکیل:

"سچل نے ہیر کے قصے کو کافیوں میں محفوظ کر دیا ہے اور یہ ایک الگ تجربہ ہے جو ہر لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے اور ان ۴۹ کافیوں میں ایک نئے حوالے سے ہیر رانجھا کی داستان عشق کا بیان دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح سے حرفی ہیر رانجھا اس سے الگ ہے جو بلاشبہ سچل کے تخلیقی کمالات کا شاہکار ہے۔

اس سارے تخلیقی اظہار میں سچل اپنے مقصد سے نہیں ہٹتے اس لئے کہتے ہیں:

میں رانجھن دی رانجھن میڈا کھیڑے کون بلائیں
لوکاں کہتے چاک مینھیں دا رانجھن سر دا سائیں

گویا سچل نے کہیں پر بھی اپنے نظریات سے ناطہ نہیں توڑا، اس لئے محمد اسلم رسول پوری نے لکھا ہے:

"حضرت سچل سرمست نے اپنے کلام میں اپنے نظریات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس لئے انھیں پیامبر شاعر تصور کرتا ہوں لیکن انھوں نے اپنے

نظریات کو درجہ سوم کے کسی شاعر کی طرح اس انداز میں نظم نہیں کیا جیسے کوئی اپنے خیالات کی واعظانہ انداز میں تبلیغ کر رہا ہو۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے ایسے خود مست انسان کا تصور ابھرتا ہے جو خود کلامی میں مصروف ہو اور اس خود کلامی میں اس کے اپنے نظریات اس خوبصورتی سے سامع کے کانوں تک پہنچ رہے ہوں کہ وہ ان کے اثرات سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔"

اور یہ رائے اس لئے بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سچل کے ہاں خود کلامی کی یہ کیفیت محسوس ہوتی ہے بلکہ اس کے اثرات بھی مرتب ہوتے نظر آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچل کی شاعری' فکر اور فلسفہ نے سندھ کی ثقافت' تہذیب' کلچر' زبان اور ریت و روایت کو بہت متاثر کیا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ انہوں نے اپنے بعد آنے والے شاعروں کو اپنے تخلیقی حصار میں لے کر ان پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اس سلسلے میں مولوی لطف علی' خواجہ فرید' قادر بخش بیدل اور حمل خان لغاری کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر شکیل' صدیق طاہر' محمد اسلم رسول پوری اور ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنے مضامین میں اس جانب اشارے کئے ہیں اور مشترکہ مثالیں بھی دی ہیں' یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سچل نے اپنی شاعری سے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آنے والے عہد کو بھی اپنے افکار سے مالا مال کرتے ہوئے دوسروں کے لئے خوشہ چینی کا سامان فراہم کیا۔

ایک روایت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے ایام ضعیفی میں جب سچل کا کلام دیکھا تو انہیں اپنا جانشین ہونے کی بشارت دی' یہ بات تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جب ۱۷۵۲ء میں شاہ عبداللطیف کا وصال ہوا تو اس وقت سچل کی عمر ۱۷۳۹ء تاریخ پیدائش کے مطابق صرف ۱۳ برس تھی' البتہ کلام کے حوالے سے اگر سچل کو شاہ عبداللطیف کا جانشین قرار دے دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقے والی بات نہیں۔

رسالہ شاہ عبداللطیف کا جو منظوم ترجمہ شیخ ایاز نے کیا ہے اس کے مقدمے کے صفحہ نمبر ۹۹ پر وہ رقم طراز ہیں:

"شاہ عبداللطیف سندھی کے وہ پہلے اور شاید آخری شاعر تھے جن کے کلام

میں سندھی زبان کی قریب قریب تمام خوبیاں موجود ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سندھی زبان صرف اس لئے زندہ رہی ہے اور رہے گی کہ اس میں شاہ جیسے عدیم المثال شاعر کا دلاویز کلام موجود ہے۔"

اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں اس لئے کہ شاہ لطیف ہر اعتبار سے عدیم المثال شاعر ہیں جن کی دلاویز شاعری سندھی زبان کا عظیم ورثہ ہے۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ سندھی زبان کے زندہ رہنے کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سچل کا بھی حصہ ہے اور یوں بھی آفاقی شاعر ہونے کے ناطے سے اور پھر نو لاکھ ۳۶ ہزار ۶ سو ۶ اشعار کا ذخیرہ چھوڑنے والے تخلیقی فنکار کی حیثیت سے سچل شاہ لطیف کے بعد دوسرے بڑے شاعر قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سچل کے روحانی کمالات اپنی جگہ اور ان کا اعتراف بھی' تاہم اپنی شاعری کے حوالے سے انہوں نے زبان' علاقے' وسیب اور شعر و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ ان کی شناخت کا بہت بڑا حوالہ بنتا ہے جو ان کے سب کمالات پر حاوی بھی ہے اور معتبر بھی۔ اس لئے بھی کہ وہ شاہ لطیف کے بعد ایسے شاعر ہیں جنہوں نے شاہ کے فکری تناظر کو اور وسعتیں عطا کی ہیں اور شاعری کے حوالے سے ان کے مقاصد کی تکمیل کی ہے۔

پاکستان میں اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری

طنز و مزاح کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اردو ادب میں اس کے تحت طنز' مزاح' ہزل' تمسخر' ضلع جگت' پھبتی' فقرے بازی اور پیروڈی وغیرہ بھی آتے ہیں۔ ویسے بنیادی طور پر طنز اور مزاح میں فرق ہے۔ سٹیفن لی کاک کے بقول: "مزاح کیا ہے' یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فن کارانہ طور پر کیا گیا ہو" رشید احمد صدیقی نے طنز کی تعریف کرتے ہوئے اس کے دائرہ کار کا تعین کیا' ان کے مطابق: "بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو"

یوں دیکھا جائے تو طنز میں مزاح اور مزاح میں طنز بنیادی طور پر شامل ہے لیکن ان دونوں میں جو باریک فرق ہے وہ رونالڈ ناکس کے مطابق: "مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔"

اردو ادب میں یہ اصطلاح ایک ساتھ آتی ہے اور اس میں موازنہ' مبالغہ تحریف اور رعایت لفظی سے کام لیا جاتا ہے اور بذلہ سنجی' شوخی' طنز' تضحیک اور ظرافت وغیرہ اس کے وسیع تر معنی کی ذیل میں آتے ہیں اور اس کے مختلف رنگ اور روپ ہیں۔ مزاح کا بنیادی مقصد شگفتگی پیدا کرنا ہے اس میں کبھی مزاح کے پیرائے میں اور کبھی طنز کے ایمائے میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ مزاح نگار کے سامنے اصلاح کا جذبہ نہیں ہوتا وہ تو اپنے قاری کو صرف ہنساتا ہے۔ طنز نگار کے ہاں اصلاح بھی مقصود نظر ہوتی ہے اور وہ ہنسی کے ساتھ ساتھ اپنے انداز میں قاری پر ایسی ضرب لگاتا ہے جو اسے سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی حالت کو درست کرے' اس حوالے سے طنز نگار یا مزاح نگار بے معنی ہنسی نہیں ہنستا بلکہ عرفان ذات یا معاشرتی شعور کے پس منظر میں سماجی مسائل کو نشانہ بناتا ہے۔

(۲)

اردو میں طنز و مزاح کی روایت خاصی قدیم ہے، شاعری کے اولین دور میں بھی اس کے نمونے مل جاتے ہیں، ولی دکنی کے ہاں واعظ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ اسی کی ایک صورت ہے۔ جعفر زٹلی کے ہاں یہ نمونے فحش گوئی کے زمرے میں آتے ہیں تاہم وہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: ”اس دور کی تیز اور جاندار آواز ہے اور اپنے طنز کے حوالے سے اسی دور کے معاشرتی زوال کی طرف توجہ دلاتا ہے۔“ شمالی ہند میں شاکر ناجی کے ہاں بھی ایسی صورت ملتی ہے۔ سودا نے اپنے لئے نیا راستہ نکالا اور پرانی راہ سے انحراف کرتے ہوئے ہجو گوئی کی طرف مائل ہوئے، ان کے ہاں شوخی بھی ہے اور تمسخر بھی۔ اس طرح ذاتی طنز بھی ہے اور شخصی بھی اور پھر معاشرتی طنز کی بھی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ انشاء اور رنگین نے ریختی سے طنز و مزاح کا کام لیا مگر یہاں درباری پن اور مسخرہ پن پیدا ہوا۔ نظیر اکبر آبادی نے ایک علیحدہ دبستان کی شکل میں سماجی برائیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا اور عوامی مسائل کے ساتھ ساتھ عوامی رسوم و رواج اور میلوں ٹھیلوں میں مزاح کی صورتوں کو نظم کیا۔ غالب نے طنز و مزاح کی ارفع روایت قائم کی ان کے مزاح کی بے ساختگی کی بنا پر حالی نے انہیں ”حیوان ظریف“ کہا ہے۔ ”اودھ پنچ“ نے طنز و مزاح کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا اور اردو میں مغربی طرز کی ظرافت در آئی۔ اکبر الہ آبادی اس دور میں ایک نئے حوالے سے سامنے آئے اور مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ علامہ اقبالؒ نے اکبر کے برعکس مقصدیت پر زور دیا۔ ایک نقاد کے بقول: ”اقبالؒ نے اپنے کلام میں سنجیدگی اور ظرافت کا ایک ایسا امتزاج پیدا کر لیا ہے کہ وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ زندگی کے مدو جزر اور نشیب و فراز دیکھتے دکھاتے اور اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی شاعری میں عالمگیر انسانی مسائل پر تنقید کر کے ایک ناگوار چیز کو گوارا بنا کر پیش کیا اور اپنے سنجیدہ مگر شگفتہ مذاق کی بدولت طعن و طنز میں بھی ایک قسم کا تقدس پیدا کر دیا۔“

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں جھک گئے مسجد میں جب وقت قیام آیا

گویا یہ ایک قرینہ اور سلیقہ تھا جو اقبالؔ کے زیر اثر بہت سے شعراء کے ہاں در آیا مگر اقبالؔ جیسی عالمگیریت اور امامت پیدا نہ ہو سکی، تاہم طنز و مزاح کی ایک مستقل روایت ضرور بن گئی۔

(۳)

محولہ بالا مستقل روایت قیام پاکستان کے بعد اور بھی مستحکم اور توانا ہوئی، فکر تونسوی کے بقول "پانچ دریاؤں کی سرزمین میں جب چھٹے دریا کا اضافہ ہوا" اور پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا تو سیاسی، اقتصادی، تمدنی، معاشرتی اور سماجی بحران بھی پیدا ہوا۔ ہجرت کے تجربے نے جن مسائل سے دوچار کیا اس کے نتیجے میں ایک غیر یقینی فضا کا نمودار ہونا یقینی امر تھا۔ اس ساری صورت حال میں جہاں اہل سیاست کو نئی مملکت کے سنوارنے اور مسائل کا حل نکالنے کا دشوار کام درپیش تھا وہاں ادیب و شاعر پر بھی بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان حالات میں ایسا ادب تخلیق کرے جو قومی امنگوں کا آئینہ دار ہو اور پیدا شدہ کیفیات اور نامساعد حالات میں قوم کو مایوسی کا شکار نہ ہونے دے۔ یاسیت کی فضا کو ختم کر کے رجائیت کی خوشگوار لہریں قوم کے دل و دماغ میں دوڑا دے، اس کے ساتھ ساتھ وہ ان برائیوں اور خرابیوں کی بھی نشاندہی کرے جو قومی تشخص کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس منصب کو طنز و مزاح کے ذریعے ہی سے پورا کیا جا سکتا تھا چنانچہ اس دور کی غیر یقینی صورت حال اور مسائل کے سیل بے کراں کی وجہ سے سماجی اقدار میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں، سیاسی صورت حال کا جو منظر نامہ بدلا اور اس تناظر میں جو اضطرابات ابھرے اور جو المیاتی کیفیات پیدا ہوئیں اس کی واضح عکاسی مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کے حوالے سے سامنے آئی اور اس طرح اسلوب و معنی کے ساتھ ساتھ موضوعی صورت حال کے پس منظر میں فکاہی ادب نے ایک چولا پہنا اور اس پیرہن سے اس کی سج دھج میں اضافہ ہوا۔ طنز و مزاح میں جو نئے رویئے اور نئے رجحانات نمو پذیر ہوئے ان کے باعث اردو شاعری ایک نئے سانچے اور ایک

نئے ذائقے سے روشناس ہوئی۔

اقبالؔ کے بعد مولانا ظفر علی خان کی نظموں میں اکبر کی روایت بڑھتی دکھائی دیتی ہے اور اس میں لب و لہجہ کی گھن گرج اور الفاظ کی تمکنت اور شکوہ کی وجہ سے زور پیدا ہوا ہے اور انہوں نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا ہے اور اپنے نظریاتی مخالفین کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے اور یہ طنز اکثر تضحیک کی شکل اختیار کر گئی ہے:

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لئے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
میوہ خوری کے لئے چننے لگے جب گول میز
رکھ لئے خود مغز، چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا
بھینس استعمار کی گابھن ہوئی مدت کے بعد
اور بڑی دقت سے اصلاحات کا انڈا دیا

جوش ملیح آبادی کے ہاں طنز کی شدت ہے اور وہ زندگی کے منفی رویوں کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کے ہاں جوش ہے مگر لطافت اور گہرائی کم ہے البتہ رباعیات میں طنز کی ایک نئی دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔ زاہد و ملا سے چھیڑ چھاڑ میں ان کا ایک الگ انداز ہے:

زاہد حدود عشق خدا سے نکل گئے
انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے
کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دین کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

چراغ حسن حسرت کے طنز و مزاح میں ہر قسم کے رنگوں کی عکاسی ملتی ہے، نثر کی طرح نظم میں بھی ان کے جوہر کھلتے اور کھلتے ہیں، البتہ ان کی طنز کے تیور کچھ اور طرح کے ہیں۔ بلینک ورس کا انہوں نے اپنی ایک نظم میں اس طرح مذاق اڑایا ہے:

چٹنیں لکھتے تھے جب اخبار میں ہم
تو مجنوں۔ لام الف لکھتا تھا دیوار دلستان پر

سنا ہے کیا کہا انگور نے آلو بخارا سے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ بھینس آہ یہ بھینس
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے جن کی جگالی کے
مرے کمرے کی تنہائی میں اکثر آ نکلتی ہیں
لئے شبنم کی چادر اور کفن نرگس کے باوا کا

کہا سوسن نے مچھر سے
کہ میری روح کا نغمہ مرے صندوق میں ہو گا
میں بھول آیا ہوں گچھا چابیوں کا آج دفتر میں
جو امرت سر سے اپنے مجھ کو حصہ آپ دے دیتے
کسی کا کیا بگڑ جاتا مرا لاہور ہو جاتا

حاجی لق لق کے ہاں طنز و مزاح کی کئی شکلیں اور صورتیں دکھائی دیتی ہیں ان کی ایک نظم بہشت بریں کا بند دیکھئے:

وہاں ہوں گے کالج نہ تدریس ہو گی
نہ قیمت کسی بک کی پچیس ہو گی
نہ جرمانہ چندہ نہ کچھ فیس ہو گی
نہ گھر والوں سے چار سو بیس ہو گی
وہاں کیسے ابا کو لوٹا کریں گے
بہشت بریں لے کے ہم کیا کریں گے

مجید لاہوری نظم و نثر دونوں کے سرخیل ہیں اور معاشرتی بدعات پر ان کا

رہوار قلم بڑی چابکدستی سے ضربیں لگاتا ہے۔ وہ سماجی ناہمواریوں اور غیر صحت مند رجحانات کو ہدف ملامت بناتے ہیں۔ ایک وزیر پر طنز کی کیفیات دیکھئے "من کہ ایک منسٹر ہوں":

دیس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں
اکبر و اقبالؔ کی تفسیر کر سکتا ہوں میں
بات پھولوں کی ہو یا قومی ترانے کا بیاں
چاٹ ہو بارہ مصالحے کی کہ ہو اردو زباں
بوعلی سینا کی حکمت' بات افلاطون کی
ایگریکلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی
داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا راز
ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبط محمود و ایاز
کشتۂ فولاد ہو یا شربت دینار ہو
ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو
جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر' مستند ہے میرا فرمایا ہوا

طنزیہ شاعری میں ایک اہم نام سید محمد جعفری کا ہے' بقول فرقت کاکوروی:
"وہ افراد کی بجائے اداروں اور اجتماعی زندگی میں جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کو کرید کرید کر لاتے ہیں اور ان پر کچھ اس انداز میں قہقہے بلند کرتے ہیں کہ پڑھنے والے بھی ان کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔" اور یہ بات واقعی درست بھی ہے کہ ان کا مجموعہ "شوخی تحریر" نام کے اعتبار سے مناسب ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ کلاسیکل شعراء کے مصرعوں کی پیوند کاری سے اپنے طنز کی کاٹ کو دوبالا کرتے ہیں' ان کی شہرہ آفاق نظم "کلرک" کا ایک بند دیکھئے:

جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر
تھا ان کی زندگی کا سارا روٹین پر

ٹی اے وصول کرنے کو اترا زمین پر
لفظ کلرک لکھا تھا لوح جبین پر
ابلیس راستے میں ملا کچھ سکھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا

سید ضمیر جعفری اردو میں مزاح نگاری کے Real تھم ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ضمیریاتی رنگ نظر آتا ہے' ان کے شعری مجموعے "مافی الضمیر" کو جدید مزاحیہ شاعری کا سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی کیفیت کم و بیش "ضمیریات" اور "ضمیر ظرافت" کی ہے۔ ان کے ہاں بھی دوسرے شعراء کے مصرعوں سے کام لینے کی ہنرمندی موجود ہے جسے وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وسعتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کر دیتے اور ایک ایسا لطف پیدا کر دیتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی نکل جاتی ہے اور اس پس منظر میں ان کا کہنا دل میں نشتر کی طرح چپ چاپ اتر جاتا ہے اور قاری کو اپنی طنزیہ نوک سے گھائل کر دیتا ہے ان کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی کی یہ رائے خاصی وقیع ہے کہ "مزاح کی یہ لطافت اور باریکی اردو میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔" سید ضمیر جعفری کی نظمیں "وبائے الاٹمنٹ" "عورتوں کی اسمبلی" اور "وزارت" خاصے کی چیزیں ہیں۔ "پرانی موٹر" کو میں ان کا شاہکار قرار دیتا ہوں' سنئے اور داد دیجئے:

یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت ساتھ چلتی ہے
بہن کی التجا ماں کی محبت ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہر مشقت ساتھ چلتی ہے
بہت کم اس خرابے کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زور دست دوستاں ہی کام آتا ہے

"ولایتی زعفران" کے نام سے انہوں نے انگریزی نظموں کے جو ترجمے کئے ہیں وہ ان کے انفرادی اسلوب اور ہنر مندی کے آئینہ دار ہیں بلکہ بعض ترجمے تو ان کی طبع زاد نظمیں محسوس ہوتی ہیں' اس حوالے سے "مسز ولیم" کی مثال دی جا سکتی

ہے:

ابھی دانتوں میں تھیں موتی کی لڑیاں لوچ بانہوں میں
ابھی کچھ ساحلی کونجوں کی حسرت تھی نگاہوں میں
وہ اس سن میں بھی اک سرو رواں تھی سیرگاہوں میں
محلے بھر کی افواہوں کا ٹیلی فون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

نوجوان شاعر اور نقاد طارق نعیم نے لکھا ہے:

"سید ضمیر جعفری کی شاعری ایسا چھتنار پیڑ ہے جس کی شاخوں نے زندگی کے صحرا میں دور دور تک چھاؤں کر رکھی ہے۔ شعر و ادب کے قافلے رنگ رس کے اس پریت پڑاؤ پر کچھ دیر دم لے کر ہی آگے روانہ ہوتے ہیں اور نئے مسافر اس کے گھنے اور بلند شاخساروں سے اپنے سفر کی سمت تلاش کریں گے۔ ان کی شاعری میں ہواؤں کا راگ سنسناتے اور آنگنوں کی آگ جلتی ہے۔ گذشتہ نصف صدی کے سناٹے میں ضمیر کی یہ مسلسل آواز منفرد بھی ہے اور معتبر بھی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لمحہ موجود میں شاعرانہ مزاح کے عہد ضمیر جعفری میں سانس لے رہے ہیں اور اس بابائے ظرافت نے کئی نسلوں کو کئی حوالوں سے متاثر کیا ہے اور خاص طور پر طنز و مزاح کا ہر راستہ اس شاہراہ سے ہو کر جاتا ہے۔

رئیس امروہوی نے بھی اپنے انداز میں اس میدان میں قدم رکھا ہے اور ان کا اسلوب مزاح الگ تھلگ ہے۔ ان کی نظم "کسی لیڈر سے خطاب" میں دیکھیے:

اے چھک چھک انجن سیاست
اے دھک دھک موٹر قیادت
اے کھد بد ہانڈی تقاریر
اے چھم چھم زیور تدابیر
اے پھٹ پھٹ ٹائر وزارت
اے نمٹ نمٹ شہرت وزارت

اے پس پس شورش بیانات
اے کھس کھس گوشہ خیالات
اے ٹک ٹک رسٹ واچ ملت
اے ٹن ٹن گھنٹہ قیادت

نذیر احمد شیخ کا نام لمرک کو رواج دینے والوں میں اہم ہے وہ انسان کی فطری خامیوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں "حرف بشاش" میں یہی صورت حال دیکھی جاسکتی ہے:

یوں سبق دیتے ہیں بیٹھے مولوی عبدالرؤف
حرف سے نکلا حروف اور ظرف سے نکلا ظروف
اب بتاؤ وقف سے نکلا ہے کیا
ایک نے اوقاف جب اٹھ کر کہا
دوسرا بولا غلط ہے مولوی جی "بے و قوف"

مرزا محمود سرحدی نے اپنے مزاحیہ مجموعے "اندیشہ شہر" میں نظموں کے ساتھ ساتھ قطعات میں اپنے دور کی سماجی ناہمواریوں اور سیاسی وقوعوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ ان کی فنی مہارت ہے کہ وہ بہت بڑی بات چار مصرعوں میں کہہ جاتے ہیں ایک قطعہ بعنوان "سابق سیاستدان" دیکھئے:

ہم نے کل اک قبر دیکھی جس پہ تھا لکھا ہوا
سونے والا اس میں اک سابق سیاستدان تھا
جب سنی یہ بات اک لیڈر نے تو ہنس کر کہا
قبر پختہ ہے تو مردہ "صاحب ایمان" تھا

قتیل شفائی اردو شاعری خاص طور پر گیت کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتے ہیں اور انہوں نے شاعری کو نغمگی عطا کی ہے۔ اگرچہ وہ مزاحیہ ادب میں دیر سے آئے ہیں مگر ان کے مجموعے "سمندر میں سیڑھی" نے اس دیر کی تلافی کر دی ہے۔
سید ضمیر جعفری نے دیباچے میں اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:
"مزاح میں بھی قتیل نے ایک نئی چھب تراشی ہے وہ کسی کو آزردہ یا مشتعل

نہیں کرتا مگر اس کے مطالعے سے قاری اپنا دل ٹٹولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے شگفتہ اور گہرے طنز سے دل کو فرحت اور ہاتھوں کو قوت ملتی ہے۔ قتیل صاحب کی طنزیہ نظموں کو دیکھ کر اس بات پر میرا یقین تازہ ہو گیا کہ جہاں وافر نعمتیں جمع ہو جائیں وہاں کسی نہ کسی نعمت کی حق تلفی ہو جاتی ہے۔ قتیل صاحب ابھی تک طنز کی حق تلفی کر رہے تھے، مجھے یقین ہے کہ اب جو وہ اس کی تلافی پر مائل ہوئے ہیں تو ان کی توجہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کی ثروت مندی کا باعث ہو گی۔ مزاح کی بہترین صورت وہ ہے جس کو قاری پسند کرتا ہو، مجھے قتیل کا مزاح پسند ہے۔"

سید ضمیر جعفری کی اس والہانہ اور کھلم کھلا پسندیدگی کے حوالے سے قتیل کی طنز کاری دیکھیے:

سارے دن کی بھیک خفیہ پاکٹوں میں ڈال کر
ایک اور اندھے سے اک اندھے بھکاری نے کہا
چل میاں اب کھول آنکھیں شام سر پر آگئی
کھائیں ہم ہوٹل میں کھانا اور دیکھیں سینما

"خدمت عوام" کے عنوان سے ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

ہمارے شہر میں
ہر اک بڑی دیوار پر
اپنے رئیس بلدیہ کے حکم سے
لکھا گیا ہے

حدودِ بلدیہ میں
منع ہے تا حکم ثانی
صاف ستھرے راستوں کی آرزو کرنا

سید ضمیر جعفری کے بعد دلاور فگار وہ شاعر ہیں جنہوں نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو ایک نیا چولا پہنایا ہے اور یہ کرتا ہر طرح کے رنگوں سے کڑھا ہوا ہے۔ مجموعوں کے اعتبار سے بھی وہ اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ شامت اعمال، آداب عرض، انگلیاں فگار اپنی، سینچری، خدا جھوٹ نہ بلوائے، مطلع عرض ہے، فی سبیل اللہ، ست

رنگی کیفیات کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ہنسنے اور رلانے کی دوہری خصوصیت موجود ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے دلاور فگار کو اس طرح سراہا ہے:

"دلاور فگار کے فن میں جو بے ساختگی' چونٹیلا پن اور نوکیلا پن ہے وہ ان کے فن کی پہچان ہے' پھر وہ نہایت پڑھے لکھے مزاح نگار ہیں' چنانچہ ان کے مزاح کا باقاعدہ ایک گہرا پس منظر ہوتا ہے اگر پڑھنے والا بھی ان کے آس پاس کا پڑھا لکھا ہو تو وہ اس مزاح سے نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اپنی شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی بھی محسوس کرتا ہے۔ اردو میں مزاح کے نام پر پھکڑپن تو بہت عام رہا ہے مگر جو چار پانچ سچ مچ کے اور اعلیٰ معیار کے مزاح نگار شعراء ہیں تو ان میں دلاور فگار کا نام نمایاں ہے۔"

اس رائے کے بعد تو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی اس لئے تقابلی حوالے سے دلاور فگار کا مزاح دیکھئے:

مشاعرے کا بھی تفریح ایم ہوتا ہے
مشاعرہ بھی کرکٹ کا گیم ہوتا ہے
وہاں یہ شرط کہ ہو زور بازوئے محمود
یہاں یہ قید کہ ہو لحن حضرت داؤد
وہاں ریاض مسلسل سے کام چلتا ہے
یہاں گلے کے سہارے کام چلتا ہے
وہاں ایل بی ڈبلیو یہاں یہ چکر ہے
کہ عندلیب مؤنث ہے یا مذکر ہے
یہاں کچھ ایسے بھی کپتان پائے جاتے ہیں
جو رن بناتے نہیں ہٹ لگائے جاتے ہیں

انور مسعود تخلیق اور انداز دونوں اعتبار سے ایک منفرد آواز ہیں۔ مرزا محمود سرحدی کی طرح انہوں نے قطعات میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے اور نظموں میں ایک نیا طرز ایجاد کیا ہے۔ سید ضمیر جعفری نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"مشاعروں کے اسٹار شاعروں کی بات اگر فلمی حوالے سے کی جائے تو میں

انور مسعود کو شاعروں کا دلیپ کمار کہوں گا‘ مگر شاعروں کے اس دلیپ کمار کا محض چہرا ہی تاثر آفریں نہیں‘ گل افشانی گفتار ہی سحر انگیز نہیں اس کی روح بھی تہدار ہے‘ اس کا شعر جتنا مشاعرے میں چمکتا ہے اتنا ہی کاغذ پر بولتا ہے‘ اس کی شاعری برگد کے درخت کی طرح بہت چھتنار اونچی اور گہری ہے وہ مشاعرے ہی نہیں لوٹتا دلوں کو بھی تسخیر کرتا ہے۔"

قاری کو ہنسنے ہنسانے‘ مشاعری سننے والوں کو لوٹ پوٹ کرنے اور اپنے انداز میں پڑھنے والے شاعر انور مسعود کا رنگ مزاح دیکھئے:

بھینس رکھنے کا تکلف ہم سے ہو سکتا نہیں
ہم نے سوکھے دودھ کا ڈبا جو ہے رکھا ہوا
گھر میں رکھیں غیر محرم کو ملازم کس لئے
کام کرنے کے لئے ابا جو ہے رکھا ہوا

اپنی زوجہ سے کہا اک مولوی نے نیک بخت
تیری تربت پر لکھیں تحریر کس مفہوم کی
اہلیہ بولی عبارت سب سے موزوں ہے یہی
دفن ہے بیوہ یہاں پر مولوی مرحوم کی

مشکور حسین یاد کی "گونگی نظموں" کو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے شہر آشوبیہ نظمیں کہا ہے ان کے ہاں مزاح کم اور طنز زیادہ ہے اور وہ بھی سنجیدگی کا پردہ لئے ہوئے ہے:

اپنی چاروں جانب پھیلے اندھے بہرے گونگے
اتنے کبھی دیکھے نہ سنے اندھے بہرے گونگے
لکھنے والا کتنے کرب سے یہ تاریخ لکھے گا
ہم ہر نازک وقت پہ ہو گئے اندھے بہرے گونگے
ہم سے بڑھ کر اندھا بہرا گونگا کیا کوئی ہو گا
ہم نے سر آنکھوں پہ بٹھائے اندھے بہرے گونگے

مسعود انور شفقی نے بھی قطعات میں اپنے جوہر دکھائے ہیں البتہ ان کی نظموں میں بھی یہ رنگ کھل کر سامنے آیا ہے ایک نظم "رانگ نمبر" دیکھئے:

اپنے دفتر کی میز سے میں نے
سخت مصروفیت کے عالم میں
سر اٹھا کر جب اس کے چہرے میں
سرسری سے نگاہ دوڑائی
میں نے دیکھا وہ درمیانہ قد
ایک فیشن پرست سی لڑکی
لمبے لمبے سے بال تھے جس کے
اور آنکھوں پہ کالا چشمہ تھا
سرخ ہونٹوں پہ تہ تھی رنگوں کی
اک عجیب و غریب صورت تھی
سنگ مرمر کی جیسے مورت تھی
اس حسینہ سے باادب ہو کر
میں نے پوچھا کہ آپ کی تعریف
اس سے پہلے بھی آپ کو شاید
ویسے دیکھا تو ہے کہیں میں نے
آپ کا نام شاہدہ تو نہیں
ہنس کے بولے معاف کیجئے گا
رانگ نمبر ملا رہے آپ
میں تعارف کرائے دیتا ہوں
اپنی سوسائٹی کا قائد ہوں
شاہدہ تو نہیں میں شاہد ہوں

حسین میر کاشمیری، عاشق محمد غوری، خضر تمیمی، نازش رضوی، ڈاکٹر شاہد الوری، عنایت علی خان، غفور ستاری، اسد جعفری ایسے مزاح نگار شاعر ہیں جن کا اپنا

ایک رنگ اور انداز ہے اور ان کے ہاں موضوعی و اسلوبی دونوں اعتبار سے نئی جہتیں ملتی ہیں۔

مزاح نگاروں کے اس ہجوم میں نیاز سواتی نے اپنا قد کاٹھ نکالا ہے۔ بعض اوقات ان کا طنز تضحیک کی صورت اختیار کر لیتا ہے تاہم اس کے پس منظر کی سچائی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ غزل کے پیرائے میں ان کا رنگ دیکھئے:

اس دیدہ دلیری سے چرائیں مری غزلیں
خود منہ پہ مرے اس نے سنائیں مری غزلیں
یوں اس نے بھری بزم میں گائیں مری غزلیں
ہر شخص کی نظروں سے گرائیں مری غزلیں
ٹی وی سے وہ چیک لے کے روانہ ہوا گھر کو
حالانکہ وہاں جا کے سنائیں مری غزلیں
اس نے مرے مقطعوں کے مٹا ڈالے تخلص
یوں قد میں ستم گر نے گھٹائیں مری غزلیں

ضیاء الحق قاسمی طنز و مزاح کی مد میں خاصا کام کر رہے ہیں اور رسالہ "ظرافت" کے حوالے سے خاصے "ان" ہیں۔ "رگ ظرافت" اور "چھیڑ خانیاں" ان کی حس مزاح اور لطیف طنز کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے ہاں عام اور مروجہ لطیفوں کو نظم کرنے کا رجحان زیادہ ہے۔ ہم عصر صورت حال پر بھی ان کا قلم رواں ہے:

لوگ ناحق شور کرتے ہیں ملاوٹ کے خلاف
یہ غلط ہے قوم کا اس سے کباڑہ ہو گیا
میری سنئے میں نے مرنے کے لئے کھایا تھا زہر
کچھ ڈکاریں آئیں میرا پیٹ ہلکا ہو گیا

رات اک سردار جی لیٹے تھے ویٹنگ روم میں
ان سے اک انگریز بولا آر یو ریلکسنگ

بے نیازانہ کہا سردار جی نے ناں جی ناں
میں ہوں گنڈا سنگھ اور جانا ہے ٹوبہ ٹیک سنگ

سرفراز شاہد طنز و مزاح کا باکمال شاعر ہے' "بلا تکلف" "کچھ تو کہئے" اور "ہیرا پھیری" کے حوالے سے جدید فکاہی ادب میں اسے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ غزل کے پیرائے میں قافیے اور ردیف کی پابندی کے بلوصف اس نے بڑی سے بڑی بات مختصر ترین الفاظ میں کہہ کر اپنی فنی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے سرفراز شاہد کو سید ضمیر جعفری کا ولی عہد قرار دیا ہے اور خود سید ضمیر جعفری نے لکھا ہے: "سرفراز شاہد کا شمار اس دور کے ان سرکردہ مزاح نگار شعراء میں ہوتا ہے جو اپنی ایک چھاپ اور شناخت رکھتے ہیں' میرے نزدیک ایک جملے میں ان کی انفرادیت یہ ہے کہ سرفراز شاہد مقبول بھی ہیں اور معقول بھی۔ وہ ہمارے معدودے چند مزاح نگاروں میں شامل ہیں جنہوں نے انتہائی جگر کائی کے ساتھ مزاحیہ شاعری کی "چادر اور چار دیواری" کا تحفظ کیا ہے":

گھر کا نمبر ملایا تو تھانہ ملا
ڈاکٹر کی جگہ ڈاک خانہ ملا
تم نہیں مل سکے اور زمانہ ملا
رانگ نمبر پہ اب اکتفا کیجئے

(فون والوں کے حق میں دعا کیجئے)

ماڈرن ہیریں تو زرداروں کے ہاں رہ جائیں گی
اور رانجھوں کے لبوں پر مرلیاں رہ جائیں گی
ہو سکے تو تم بچا لو اب بھی دیسی نسل کو
ورنہ پیچھے صرف "شیور" مرغیاں رہ جائیں گی
مرغ پر فورا جھپٹ دعوت میں ورنہ بعد میں
شوربہ اور گردنوں کی بوٹیاں رہ جائیں گی

ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے سنجیدہ شاعری سے توبہ نہ کرتے ہوئے بھی مزاحیہ شاعری کی طرف اپنی سوچ و فکر کا دھارا موڑا ہے اور اس میں بھی اپنے ہونے اور رہ

جانے کا ثبوت فراہم کیا ہے اور روز مرہ کی صورت حال کو بڑے سادہ مگر پرکار طریقے سے پینٹ کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی جیسے عظیم مزاح نگار نے انہیں اس طرح سراہا:

"ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی شاعری میں طنز و فکر کا نہایت کامیاب اور حسین امتزاج ملتا ہے۔ آمد ہی آمد ہے مگر ایسی آمد جو ریاض' ذہانت اور ذوق سلیم کی بھی طالب ہے۔ وہ عصری رجحانات اور مزاحیہ شاعری کے مزاج اور روایت سے آشنا ہی نہیں متاثر و مستفید بھی ہوئے ہیں۔ معاشرے کے مصائب و تضادات پر ان کی گہری نظر اور گرفت مضبوط ہے اور یہی ان کے منفرد انداز کو توانائی بخشتی ہے۔"

اس حوالے سے ان کا مزاحیہ شعری مجموعہ "خوش کلامیاں" فکاہی ادب میں ہر اعتبار سے وادھا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انداز بیاں دیکھئے:

بیٹھی رہے گی کب تک تیرے لئے ثریا
ملتان جانے والوں کا آچکا بھی لیہ
اب بھی جو تو نے اپنا بدلا نہیں رویہ
تے فیر ایہہ پکی گل اے پئی ہن او ہتھو گئی آ
جیبی حبی حبی جیبی حبی حبی

علم کا رعب ٹھیک ہے لیکن
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو
کر لیا ہے جو تم نے ایم اے تو
ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

غزل کا بھی انداز دیکھئے:

کس عکس میں نقص نہیں ہوتا کس ڈھول میں پول نہیں ہوتا
وہ کونسی ایسی محفل ہے جس میں بقلول نہیں ہوتا
اب کھیل رچا ہی بیٹھے ہو تو اتنا دھیان رہے پیارے
ہاکی میں رنز نہیں بنتیں کرکٹ میں گول نہیں ہوتا

اماں کو پسند آتی ہی نہیں میرے لئے کوئی لڑکی بھی
یا آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں یا چہرا گول نہیں ہوتا

یوں دیکھا جائے تو اردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ایک توانا روایت قائم ہو رہی ہے جس میں تنفیر فاروقی' عزیز فیضی' امداد نظامی' اسرار عارفی' شباب طلعت' ڈاکٹر سید انعام احسن حریف' انعام درانی' خالد عرفان اور گلزار بخاری اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ فارغ بخاری اور ظفراقبال جیسے مقتدر شعراء نے بھی فکاہی ادب تخلیق کیا ہے اور یہ اس کی معقولیت اور مقبولیت کی دلیل ہے۔

اس تناظر میں اگر طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے تخلیقی رویوں اور عصری موضوعات کو دیکھا جائے اور پرکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر شاعر کسی نہ کسی حوالے سے اپنے عہد اور اپنے عصر کی ترجمانی کر رہا ہے اور معاشرتی صورت حال پر اپنے اپنے اسلوب میں اپنا رہوار قلم دوڑا رہا ہے اور اس میں یقینی طور پر جدت بھی ہے اور نیا پن بھی۔ اسلوب کی تازگی بھی ہے اور موضوع کی شادابی بھی' فکری ارتقاء بھی ہے اور ذہنی ارتفاع بھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مضمون "ہم عصر تخلیقی رویئے اور مزاح" میں رقم طراز ہیں:

"امریکہ میں ان دنوں "بلیک ہیومر" کا چرچا ہے' یہ سیاہ مزاح وہاں کے سیاہ فام باشندوں کی تخلیق ہے اور نسل پرستی کے عفریت کے خلاف رد عمل کے تخلیقی سطح پر اظہار کا ایک انداز ہے۔ میں نے بلیک ہیومر سے ملتے جلتے نمونے اپنے ادب میں تلاش کرنے کی سعی کی مگر غالب کے اس شعر کی استثنائی مثال سے قطع نظر اور کوئی نمونہ نہ ملتہ

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

دن کی روشنی تحفظ کی علامت ہے جب کہ رات کی تاریکی دست قاتل چھپائے ملتی ہے۔ دن کے اجالے میں لٹنے والے ہمیشہ واویلا کریں گے اس لئے کہ ان میں غالب کی مانند شعور مزاح نہیں' جب غالب نے یہ کہا کہ دن کو لٹنے کا یہ فائدہ ہوا

کہ میں اب رات کو بھی بے خبر سوتا ہوں نور اس بنا پر وہ رہزن کو دعا دیتا ہے تو داخلی تضادات کی حامل یہ صورت حال جس مزاح کو جنم دیتی ہے وہ انہی خصائص کا حامل نظر آتا ہے جنہیں بلیک ہیومر کی جدید ترین اصطلاح سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ آج ہماری سائیکی بھی کچھ ایسے ہی عمل سے گزر رہی ہے اور دن میں لٹنے کا احساس اور اس کی چبھن شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے لیکن ہم میں غالب والا رویہ نہیں اس لئے ہم دن گزیدہ رات کو سو بھی نہیں سکتے' رہزن کو دعا دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شائد اسی لئے آج کا ادب بے خوابی کی پیداوار ہے اور جب بھی اتفاق سے نیند آجائے تو "نائٹ میئرز" بیدار کر دیتے ہیں۔ اس نفسی مرض کا ایک ہی علاج ہے' ہنسی! خود پر' دوسروں پر' معاشرہ پر!"

یہ طویل اقتباس میں نے اس لئے بھی دیا ہے کہ اس میں ایک نفسیاتی نقاد نے نفسیاتی تجزیئے اور انسانی سائیکی کے حوالے سے ہم عصر مزاح کا جائزہ لیا ہے' دوسرے اس سے فکاہی ادب کی قدر و قیمت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تاہم اب صورت حال اس سے قطعی طور پر مختلف ہے' اس لئے آج کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری بے خوابی کی نہیں بلکہ بیداری کی پیداوار بھی ہے اور جاگتے رہنے میں خواب دیکھنے کی آئینہ دار بھی' اور جو جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اردو میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا گراف معیار اور مقدار کے اعتبار سے بہت اونچا ہے اور ویسے بھی جب ہمارا ادب بہت سے بحرانوں سے گزر رہا ہے اور ایک عہد زوال کی صورت حال کا سامنا ہے تو اس تناظر میں مزاحیہ ادب ہی ہے جو ہر اعتبار سے غم بھلانے' دکھوں کو فراموش کرنے' ہنسنے ہنسانے یا رونے رلانے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے اور اس طرح آج کے غمزدہ انسان کا کیتھارسس ہو رہا ہے۔ سید ضمیر جعفری نے درست کہا ہے:

"طنز و مزاح قوموں کو پالش کرنے کے لئے ہے مالش کرنے کے لئے نہیں!"

کیا لمحہ موجود کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ذہنوں کو پالش نہیں کر رہی؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو میں سمجھتا ہوں اسی میں ہی اس شاعری کا جواز مضمر ہے۔ اور دلاور فگار نے یہ جواز "کراچی کی بس" میں اس طرح پیش کیا ہے:

بس میں لٹک رہا تھا کوئی ہار کی طرح
کوئی پڑا تھا سایہ دیوار کی طرح
سہما ہوا تھا کوئی گنہ گار کی طرح
کوئی پھنسا تھا مرغ گرفتار کی طرح
محروم ہو گیا تھا کوئی ایک پاؤں سے
جوتا بدل گیا تھا کسی کی کھڑاؤں سے
کوئی پکارتا تھا مری جیب کٹ گئی
کہتا تھا کوئی میری نئی پینٹ پھٹ گئی
بس میں تمام پردوں کی دیوار ہٹ گئی
ریش سفید زلف سیاہ سے لپٹ گئی
اک اچھا خاصا مرد زنانے میں گھس گیا
گویا کہ ایک چور خزانے میں گھس گیا

تنقید کے نفسیاتی دبستان کا سرخیل

ڈاکٹر سلیم اختر

اردو تنقید میں ڈاکٹر سلیم اختر کا نام بہت اہم ہے خاص طور پر نفسیات کے تناظر میں انہوں نے اردو ادب کی کئی اصناف کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور یوں اس وقت وہ برصغیر پاک و ہند کے واحد نقاد ہیں جنہیں نفسیاتی تنقید کے دبستان کا سرخیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

بقول شمیم احمد:

> "انہوں نے نفسیات کو جس طرح ہمارے ادبی تشخص کی دریافت کے لئے استعمال کیا ہے اس سے ہمارے بعض ادبی سلسلوں کا سراغ مل جاتا ہے" 1

اگر ہم ڈاکٹر سلیم اختر کی تخلیقات اور ان کی تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کریں تو واقعی یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے نفسیات کے حوالے سے ادبی تشخص کی دریافت اور ادبی سلسلوں کا سراغ لگایا ہے۔ نگاہ اور نقطے سے لے کر شعور ولاشعور کا شاعر غالب تک ان کی تمام تنقیدات اس سے متوصف ہیں۔

اردو میں نفسیاتی تنقید فرائیڈ کے زیر اثر اردو میں آئی اور پھر نفسیات سے دلچسپی رکھنے والوں نے یونگ ایڈلر اور سیکڈوگل کے نظریات و افکار سے استفادہ کر کے اسے آگے بڑھایا حالی کی جدید اردو تنقید کی روایت نے اردو تنقید کو خاص وسعت دی اور یوں مغربی تنقید بھی مشرقی تنقید میں در آئی۔ جہاں تک نفسیاتی تنقید کا تعلق ہے خود ڈاکٹر سلیم اختر نے مرزا رسوا کے ہاں اس کے نمونے تلاش کئے اور پھر اس بات کا سراغ لگایا کہ اردو میں نفسیاتی تنقید کا آغاز میرا جی نے کیا۔ اس کے بعد آفتاب احمد، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر اختر اور نیوی، ریاض احمد، ڈاکٹر محمد حسن، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وحید قریشی، شبیہ الحسن نونہروی اور ڈاکٹر ابن فرید نے اسے آگے بڑھایا۔ ان سب میں ڈاکٹر سلیم اختر وہ واحد نقاد ہیں۔ جنہوں نے بھرپور طریقے سے اردو ادب پر نفسیات کا اطلاق کیا حتی کہ علامہ اقبال کا بھی نفسیاتی تجزیہ کر ڈالا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کو طالب علمی کے زمانے ہی سے نفسیات سے شغف رہا ہے اور بی۔ اے میں ان کا ایک مضمون نفسیات تھا اور جس کے لئے انہوں نے انگریزی کتابوں کا مطالعہ کیا اور نفسیات کی اساسی مباحث سے بھی واقفیت حاصل کی۔ ان کا پہلا مضمون "غزل میں تصور محبوب" مطبوعہ نیرنگ خیال راولپنڈی

جنوری 1954ء اگر چہ ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں تاہم اس کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ ضرور ہے۔ اس لئے کہ اس میں جنس اور جنسیات کی موجودگی کے تناظر میں ان کی نفسیات سے گہری دلچسپی کا سراغ مل جاتا ہے اور یوں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے ابتداء ہی سے نفسیاتی تنقید کی جانب توجہ دینا شروع کر دی تھی اور یہ خصوصیت اردو کے کسی انقاد کو حاصل نہیں۔ خاص طور پر ان کے اولین تنقیدی مضامین کا مطالعہ کر کے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان میں آغاز ہی سے تنقیدی اپچ اور تنقیدی بصیرت موجود تھی جو ان کے روشن مستقبل اور بڑے نقاد بننے کی واضح نشاندہی کر رہی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان کے اولین نقوش تنقید کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "ان کی ابتدائی تحریریوں میں بھی وہ کچاپن نظر نہیں آتا۔ جو نووارِدوں کے یہاں عموماً پایا جاتا ہے۔ جھلاہٹ، ادھ کچے خیالات، خودنمائی اظہار علم، طعن وتعریض اور خودستائی ان کے یہاں کہیں نہیں ہے۔
> الفاظ کی شعبدہ گری اور خیالات کا ہیر پھیر ان کے یہاں نظر نہیں آتا جملے بازی کا فن بھی ان کے یہاں نہیں ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانے یا قاری کو خواہ مخواہ چونکانے کی کوشش بھی ان کے یہاں نہیں ملتی دوسروں کی کہی ہوئی بات کو اپنے الفاظ میں خوبصورتی سے دہرانے یا غیر ضروری حوالوں کے ذریعے قاری پر رعب جمانے کے ڈھب سے بھی وہ ناواقف ہیں"۔

اس کے برعکس ان کے دوسرے ہمعصر نقادوں میں یہ خصوصیات نہیں ملتیں، مثال کے طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقیدات کا حال اتنا پتلا ہے کہ ایک جملہ پڑھتے ہی قاری کی طبعیت اکتانے لگتی ہے اس بات کے ثبوت کے لئے وارث علوی اور فضیل جعفری کے مضامین پڑھے جا سکتے ہیں۔ البتہ حوالے کے لئے شمیم احمد کا ایک اقتباس دیکھئے "اردو شاعری کا مزاج جن الگ الگ مقالات سے تشکیل دیا گیا ہے وہ عالم تحقیق کی سطح سے کسی طرح مختلف اور بلند نہیں کیونکہ مصنف نے اپنے اشہاب قلم کی جولان گاہ صرف ادب کو نہیں بنایا ہے بلکہ اس نے مختلف اہم کتابوں سے انسان کے وجود اور اس کے ارتقاء کی داستان، تاریخ سے مختلف اقوام کی ابتداء اور خصوصیت سے ہندوستان کی قدیم عہد کی تاریخ اور اس کی مماثلت، تاریخ ادب اور بالخصوص ہندی تاریخ ادب سے اس کی مختلف اصناف اور اس کی تفصیلات، تاریخ لسانیات سے لسانی اصول اور ہندوستان کے لسانی مسائل کا جائزہ اور غزل ونظم کی عام ادبی تاریخ سے مواد مہیا کر کے ایک جدید معیار تحقیق سے ایک لڑی میں پرو دیا ہے

جس کا کوئی تعلق مصنف کے اپنے ذاتی تجربات شعور اور ادبی نظریہ سے نہیں ہے اور نہ ان تاریخی لسانی، فلسفیانہ، سائنسی اور نفسیاتی محرکات سے شاعری کا باطنی اور حقیقی تعلق واضع کیا ہے۔ قدیم ہندی تمدن آریائی تہذیب اور ہندوستان کی تاریخی اور سماجی پس منظر کا یہ بلغور بہت اناڑی پن کی کیفیت کے ساتھ بغیر کسی تخلیقی شعور اور عمل کے اردو شاعری سے زبردستی پیوند کر دیا گیا ہے۔ "اردو شاعری کا مزاج" دراصل اردو شاعری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی وہ صرف ہندوستان کی تہذیب اس کے مزاج اس کی ادبی اصناف پر نوٹس میں جو مختلف عنوان کے تحت لئے گئے ہیں۔ ایک ایسا انتخاب ضرور ہے۔ جس میں اردو شاعری کے مزاج کا پتہ چلانا کاردارد ہے۔

اس سے ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید اور ان کے بعض معاصرین کی تنقیدات کا تقابل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور اگر شمیم احمد اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آراء کو جو اوپر کہیں درج کی گئی ہیں پیش نظر رکھا جائے تو صحیح صورت حال واضع ہو جاتی ہے اس کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے بھی ملا لیجئے تو پورا منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے۔ دیکھئے۔

> "ڈاکٹر سلیم اختر کی ناقدانہ صلاحیتیں اتنی ہمہ گیر اور بھرپور ہیں کہ وہ فن پارے کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور تخلیق کار کی نفسیاتی ساخت سے لے کر معاشرے کے جبر اور روایت کے اثرات سے نمٹتا ہوا نفظیات کی نوعیت تک کھنگال ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی یہی جز رسی اسے بیشتر نقادوں سے ممیّز کرتی ہے"۔

یوں دیکھا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر وہ واحد نقاد ہیں جنہوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے تخلیق کاروں اور تخلیقی شہ پاروں کی تحلیل نفسی پر بھرپور توجہ دی ہے۔ ان کی نفسیاتی تنقید کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ تنقید، نفسیاتی تنقید اور اس سے متعلق پہلوؤں پر ڈاکٹر سلیم اختر کے خیالات کا جائزہ لیا جائے تا کہ ان کے تنقیدی نظریات نفسانی محرکات اور اطلاقات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

"نگاہ اور نقطے" کے پیش لفظ میں خود لکھتے ہیں۔

"میرے تنقیدی شعور کے مظہر زاویہ نگاہ کی تشکیل نفسیاتی مطالعہ کی مرہون منت ہے"۔

> "تنقید میں اساسی اہمیت نقاد کے زاویہ نگاہ کی ہے اور مجھے اپنے بارے میں صرف یہی بتانا ہے کہ میرا زاویہ نگاہ نفسیاتی ہے"

ایک انٹرویو میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوں فرمایا:

"میں نے جو کچھ بھی لکھا اس میں بیشتر نفسیات کی روشنی میں لکھا اس لئے اس کو ہی میرا ادبی نقطہ نظر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے میں نے کرداروں کی پس پردہ لاشعوری کیفیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ تنقید میں نفسیات کی امداد سے تخلیقات اور تخلیق کاروں کی شخصیات کو نئے زاویہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اس حد تک کہ اب یہی میرا "ٹریڈ مارک" قرار پایا ہے"۔

ایک اور گفتگو میں اپنے نظریہ تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:-

"جہاں تک میرے ذاتی نظریہ تنقید کا تعلق ہے ایک تو میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں کوئی ایسا نظریہ پیش کرتا کہ جس پر ذاتی کی چھاپ لگی ہوئی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحیثیت نقاد میں خود کو ابھی In the making تصور کرتا ہوں۔ ابھی تک میرے مطالعے کی حدود پھیل رہی ہیں اور مختلف علوم سے روشناسی کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے تاہم جو تھوڑا بہت میں نے لکھا ہے اس کے مطالعے سے یہ واضع ہو جاتا ہی کہ میرا جھکاؤ نفسیاتی تنقید کی طرف ہے۔ نفسیاتی تنقید کے آغاز میں۔ میں نے فرائید سے اثرات قبول کئے مگر مزید مطالعے کے بعد جب یونگ تک پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ یونگ میں جو گہرائی ہے اس کے اجتماعی لاشعور کے تصور میں جو قوت ہے وہ فرائیڈ کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یونگ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ میں نے اینتھروپالوجی اور مائیتھالوجی کا بھی مطالعہ کیا جن سے مجھے علامات وغیرہ کی تفہیم میں خاصی مدد ملی ہیں اگرچہ خود مصور نہیں ہوں لیکن مجھے مصوری سے دلچسپی ہے اور میں نے اپنی محدود بساط میں مصوری کے بارے میں جو مطالعہ کیا ہے اس کی جھلک میری تنقیدوں میں نظر آتی ہے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر میرے مخصوص تنقیدی شعور کی تشکیل کی ہے لیکن یہ واضع رہے کہ نفسیات کو اس میں اولیت حاصل ہے"۔

یوں دیکھا جائے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے جتنا مطالعہ بھی کیا ہے اس میں نفسیات کا حوالہ موجود ہے اور انہوں نے نفسیات کے حوالے ہی سے ہر ادب پارے کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے نقاروں نے بھی کہ جن کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے ضمنی طور پر نفسیاتی تنقید کے سانچے کو استعمال کیا جن میں میرا جی اور محمد حسن عسکری شامل ہیں لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے خصوصی طور پر نفسیات کو اپنایا اور ان کا نفسیاتی نقطہ نظر مستقل حیثیت کا حامل ہے کہ انہوں نے کہیں بھی نفسیات اور نفسیاتی حوالے سے انحراف نہیں کیا اور ان کی ہر تحریر میں نفسیاتی تنقید کے نقطہ نظر کی کارفرمائی نظر آئی ہے، خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے یونگ کی تحلیل نفسیات کا سانچہ ضرور بنایا ہے مگر اسے اپنے مشرقی پس منظر میں رکھ کر فن پاروں کو جانچا ہے اور انگریزی دان نقادوں کی طرح حلیہ نہیں بگاڑا چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا اور انہوں نے لکھا:-

سلیم اختر نے اردو تنقید کو نفسیات کے گہرے مطالعے سے جو گہرائی اور توانائی کی عطا کی ہے۔ اس کا اعتراف ان کے دشمن بھی کریں گے اور سچی بات تو یہ ہے کہ سلیم اختر کے ان مضامین نے اردو تنقید کے افق کو وسیع کیا ہے اور اسے وہ گرم گرم لہو مہیا کیا ہے جس کی کمی کے آشوب میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا تھی"۔

اس تناظر میں ڈاکٹر سلیم اختر اردو کے بہت ہی اہم اور اردو تنقید کے نفسیاتی دبستان کے اہم ترین نقاد ہیں اور تعصب سے بالاتر ہو کر اور توازن کے ساتھ نقاد کا منصب ادا کر رہے ہیں اور شخصی حوالے کی بجائے فن پارے کو سامنے رکھنا ان کا شیوہ اور طریق کار ہے اور اس وجہ سے ان سے اور خاص طور پر ان کی تنقید سے ناراض لوگوں کی تعداد کافی سے زیادہ ہے اس سلسلے مین "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" قابل ذکر ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی اب تک جو تنقیدی کتابیں آ چکی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

1- نگاہ اور نقطے — فروری 1968ء

2- اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — پہلا ایڈیشن ستمبر 1971ء
گیارھواں ایڈیشن جنوری 1986ء

3- تنقیدی دبستان — 1973ء

4- افسانہ حقیقت سے علامت تک — 1976ء

5- ادب اور لاشعور — 1976ء

6- تخلیق اور لاشعوری محرکات — 1983ء

7- ادب اور کلچر — 1984ء

8- شعور اور لاشعور کا شاعر غالب 1985ء

9- اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (زیر طبع)

نگاہ اور نقطے ڈاکٹر سلیم اختر کی اولین تنقیدی کتاب ہے اور اس کے بیشتر مضامین ادبی رسائل میں شائع ہو کر ڈاکٹر سلیم اختر کے لئے نفسیاتی نقاد کا ایک طرح سے معتبر حوالہ بن چکے تھے۔ اس کتاب کے پہلے مضمون "زیوس سے امیر حمزہ تک" میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اساطیر اور داستانوں کے تعلق کو یونگ کے اجتماعی لاشعور کے حوالے سے پرکھا ہے۔ "منٹو خطوط کے آئینے میں، احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے خطوط کا احاطہ کرتا ہے اور ان خطوط کے حوالہ سے انہوں نے منٹو کی شخصیت کی مخفی پرتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے منٹو کے مزاج کے مختلف کیفیات اس کے افسانوں کے پس منظر اور اس کی بیماری کا سراغ بھی مل جاتا ہے۔ خود منٹو نے اپنے خطوط میں اپنی ذات کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے منٹو کی ذاتی تحریروں کو سامنے رکھ کر اس کی تحلیل نفسی کی ہے اور یوں اصل منٹو کو سامنے لے آئے ہیں اس طرح یہ مضمون شخصی اور ادبی دونوں حوالوں سے منٹو کو سمجھنے میں نہ صرف مدد دیتا ہے بلکہ مزید مطالعے کا سبب بھی بنتا ہے۔

"مرزا رسوا کا نظریہ ناول نگاری" اس کتاب کا اہم مضمون ہے۔ اس میں نفسیاتی حوالے سے مرزا رسوا کے ناولوں کے مطالعے سے اس کی ناول نگاری کے بارے میں نظریات کا سراغ لگایا گیا ہے اور اسے پہلے نفسیاتی ناول نگار اور پہلا نفسیاتی نقاد قرار دیا ہے غالب کے سلسلے میں تین مضامین۔ "غالب کی شخصیت اور شاعری کا نئے حوالے سے مطالعہ ہیں اور غالب کے باطن میں جھانک کی اصل کیفیت دکھا دی گئی ہے۔ جس سے غالب کے تضادات کھل کر سامنے آئے ہیں۔ غالب کے خطوط کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے غالب کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور منٹو سے بھی موازنہ کیا ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق اپنی شاعری میں نرگسی انداز رکھنے والا غالب اپنے خطوط میں خوشامدیں کرتا، ہاتھ پھیلاتا، اور ایسی عاجزی وانکساری کا شکار نظر آتا ہے جو انا کو مجروح کرتی ہے ان خطوط میں اندر کا خوف، بے بسی اور احساس مرگ کا شعور واضع ہے اور اس طرح بقول ان کے "غالب نے ان خطوط میں اپنے آپ کو ننگا کر دیا ہے"۔

اسی طرح "مرد عاشق کی مثال غالب" میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اس عہد کے فرد اور ماحول کے تصادم سے جنم لینے والی نفسیاتی کیفیات کا سراغ لگایا ہے۔

"باغ و بہار کے درویش عاشق" دراصل اردو غزل کے وہ روایتی عاشق ہیں جو قدیم شعراء کی غزلوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مضمون میں باغ و بہار کے ان چاروں کرداروں کا

نفسیاتی حوالے سے جائزہ لے کر دلچسپ نتائج نکالے ہیں اور ان کا میر کی غزل کے عاشقوں سے تقابلی مطالعہ کیا ہے اور ان دونوں میں مماثلت دریافت کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کی جنسی رویوں کی بھی نشاندہی کی ہے اور ان کے جذبہ عشق کی اساس جنسی جذبے کو قرار دیا ہے "چند ہمعصر" کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے درست نتیجہ نکالا ہے کہ وہ شخصیت نگاری کے سلسلے میں نفسیاتی رجحانات اور لاشعوری محرکات کا نظر انداز کر جاتے ہیں اور اس طرح ان کا انداز میکانکی ہے۔

"ابن الوقت" میں نذیر احمد کی ناول نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے کرداروں کو نفسیاتی سانچے سے جانچا ہے اور تہذیبی پس منظر میں پرکھا ہے افسانہ حقیقت سے علامت تک "ڈاکٹر سلیم اختر کی افسانوی تنقید کے سلسلے کی وہ کتاب ہے جو بقول سید وقار عظیم "اردو فکشن کی تنقید کے سلسلے کی وہ کتاب ہے جو بقول سید وقار عظیم "اردو فکشن کی تنقید میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ بڑا خوشگوار جھونکا" اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے نزدیک "افسانوی ادب پر تنقید میں معرکتہ الارا کتاب، ڈاکٹر سلیم اختر سے پہلے کے نقادوں نے جن میں سید وقار عظیم بھی شامل ہیں۔ افسانوں کے مطالعے کے برعکس افسانہ نگاروں کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کئے ہیں۔ مگر ڈاکٹر سلیم اختر وہ واحد نقاد ہیں جنہوں نے افسانے کو پیش نظر رکھا ہے اور اپنے وسیع مطالعے اور بالغ نظری سے افسانے کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ایک طویل عرصے بعد یہ کتاب سوچ کی نئی جہتیں لے کر فضائے ادب پر روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئی ہے۔ جس میں اردو افسانے کے اسلوب ہستی پر تبدیلیوں اور مواد و موضوعات کے نفسیاتی حوالوں سے تجزیے کئے گئے ہیں اور افسانے میں جو نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں ان کی بھی بڑی دیانت داری اور بے تعصبی سے نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین اردو کا پہلا جنسی افسانہ، افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ مختصر افسانہ، اعتراضات اور جوابات، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ، نفسیاتی افسانہ، روح عصر اور افسانہ، اردو افسانہ میں عورت، احمد ندیم قاسمی کے افسانے، کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے۔ متھن کا تجرباتی مطالعہ سبھی افسانے کے موضوعات سے متعلق ہیں اور افسانے کے مباحث اور فنی حوالے سے اٹھائے گئے سوالات کا جواب فراہم کرتے ہیں اور افسانوی صورت حال کی وضاحت بھی اس کے ساتھ صنف افسانہ کا مطالعہ بھی ہیں اور انفرادی سطح پر بعض افسانہ نگاروں کے فن کا تجزیہ بھی۔

ان سب مضامین میں سلیم اختر کا یہ نظریہ کارفرما نظر آتا ہے کہ نفسیاتی مطالعہ ادب پارے کی تکمیل کے بعد سے نہیں اس کی تخلیق سے پہلے شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بعض انکشافات بھی گئے ہیں مثال کے طور پر انہوں نے یلدرم کو پہلا جنسی افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ مختصر افسانہ میں بعض اختلافی اور نزاعی موضوعات

چھیڑ کر افسانے کے فن کی مبادیات اور اساسی رجحانات کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے۔

اس طرح افسانے اور اس کے فن کی مختلف جہات کے علاوہ افسانہ نگاروں کے نفسی محرکات کا بھی سراغ لگایا ہے۔ چنانچہ "افسانہ حقیقت سے علامت تک" کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب میں افسانہ کے بنیادی موضوعات کو پیش نظر رکھ کر بڑی بے باکی، اعتماد اور جرات کے ساتھ قلم اٹھایا ہے بقول محمد علی صدیقی "یہ ایک ایسے نقاد کی تحریر ہے جس کی تنقیدی افکار سے اختلاف رائے تو کیا جا سکتا ہے لیکن تنقیدی دیانت سے انکار ممکن نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ یہ صحت مند اختلاف کی دعوت دیتی ہے"۔

اس سے بڑھ کر اس کتاب کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی رویے کو اور کس طرح سراہا جا سکتا ہے اور ایسے وقت میں کہ جب ان کے بہت سے ہمعصر نقادوں کی تنقیدات سے ایمان اٹھ چکا ہے کہ وہ گروہی، تعصبی اور مداحی تنقید کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر بے خونی، بے تعصبی اور دھڑے بندی سے بالاتر ہو کر تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔ ادب اور لاشعور ڈاکٹر سلیم اختر کی وہ تنقیدی کتاب ہے جسے 1976ء میں داؤد ادبی انعام مل چکا ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ نفسیات کے حوالے سے ادب، تنقید زبان و بیان اور مختلف اصناف کا مطالعہ کیا گیا ہے "ادب، تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل" میں ادب اس کے مقاصد ادب اور اخلاق ادب اور حصول مسرت اور خاص طور پر تخلیقی محرکات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ ادیب اور قاری کے رشتے کو بھی اجاگر کیا ہے اور ادب کی اثر پذیری کے لئے نفسیاتی عوامل کو ضروری قرار دیا ہے۔ پہلے حصے کے بعض مضامین "ادب" میں مثلاً ادب اور تخلیقی لاشعور" میں بڑی وضاحت کے ساتھ افلاطون سے لے کر یونگ تک کے لاشعور کے بارے میں نظریات و افکار کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس طرح لاشعور کی اہمیت اور مرکزیت کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ادب اور نرگسیت ڈاکٹر سلیم اختر کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس سے قبل وہ غالب کے ہاں نرگسیت کی واضح نشاندہی کر چکے ہیں (نگاہ اور نقطے میں اس کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے) یہاں غالب کے ساتھ ساتھ غزل اور داستانوں میں نرگسی رویے تلاش کئے گئے ہیں۔

دوسرے حصے مسائل کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے تخلیق کار کی اتھارٹی، ادب اور ابلاغ، ادب اور زبان، ادب اور اخلاقی اقدار اور ادب اور فنون لطیفہ جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تیسرے حصے اصناف میں

تنقید اور لاشعور غزل، تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ، مرثیہ اور کتھارسس اور انشائیہ اور انسانی سائیکی جیسے پر موضوعات کا مطالعہ شامل ہیں۔

"تنقید اور لاشعور" میں انہوں نے اردو ادب میں نفسیاتی تنقید کا سراغ لگایا ہے اور مرزا رسوا کو اردو کا پہلا نفسیاتی نقاد قرار دے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو تنقید میں نفسیاتی تنقید کے آثار قدیم تر ہیں۔

غزل۔ تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ۔" میں انہوں نے غزل کے حوالے سے تخلیق کاروں اور تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور تلازمہ خیالات کی اہمیت کو واضع کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم نے قافیہ اور ردیف کو بھی نفسیاتی اہمیت کا حامل گردانتے ہوئے مقطع کو شاعر کے ذاتی حوالے سے نفسی تسکین اور لاشعور محرکات کا مظہر قرار دیا ہے اور اسے انسانی نفسیات اور خود تخلیق کار کے نفسی عوامل کے اخراج کا وسیلہ بتایا ہے۔

انشائیے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے اپنے الگ اور منفرد نظریات ہیں اور ان کی یہ رائے ہر پہلو سے صحیح ہے کہ انشائیہ نگار انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔

اس اعتبار سے "ادب اور لاشعور" نفسیاتی تنقید کی ایک مکمل اور اہم ترین کتاب ہے۔ جس میں بڑی سنجیدگی سے ادب، اس کے مسائل اور ادبی اصناف کا مطالعہ کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لئے بہت سی دوسری کتابوں کا مطالعہ ناگزیر بن جاتا ہے۔

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں بھی سلیم اختر نے بعض شاعروں کا نفسیاتی زاویے سے مطالعہ کیا ہے اور یوں وہ تاریخ میں بھی نفسیات کو لے آئے ہیں۔ اقبالیات کے ضمن میں "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ان کا اہم ترین مضمون ہے جو وجہ نزاع بھی بنا اور اسے بے حد سراہا بھی گیا۔ اس میں خاص طور پر انہوں نے اقبال کی رومانی زندگی کا مطالعہ نفسیات کے حوالے سے کیا ہے اور اقبال کی ذہنی کش مکش اور ناآسودگی کے مضمرات تلاش کرنے کی سعی کی ہے ادب اور کلچر میں ادب، شخصیات، تخلیقی رویے مباحث اور کلچر کے عنوانات کے تحت انہوں نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے اور ان سب مضامین میں نفسیات کسی نہ کسی انداز میں موجود ہے۔ محمد افسر ساجد کے بقول " مختلف ادبی موضوعات کے بارے میں وضع کردہ نظریات مصنف کی بطور ایک ممتاز ادبی نقاد قدر و منزلت میں اضافہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی قاری کے علم میں بھی" چنانچہ ادب اور کلچر کی اہمیت کسی طور پر بھی کم نہیں اور اس میں ڈاکٹر سلیم اختر کا بے پناہ مطالعہ، گہری سوچ اور مستند نتائج سامنے آئے ہیں اور ایک اعتبار سے اس موضوع پر جو کمی محسوس کی جا رہی تھی اسے پورا کر دیا گیا ہے۔

"شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب، ڈاکٹر سلیم اختر کی اہم ترین کتاب ہے۔ جو غالب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور غالبیات کی مد میں اضافہ۔ غالبیات کے سلسلے میں بہت کام ہوا ہے اور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی غالب پر کئی نئے زاویوں سے مضامین لکھے، کچھ مضامین کا ذکر گزشتہ اوراق میں بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب میں شامل سبھی مضامین غالب کے لئے مطالعے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب کا نام بھی بذات خود نفسیاتی معنویت لئے ہوئے ہے اور اس میں شعور اور لاشعور کی علامتوں کے ذریعے غالب کے فکر و فن کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کے باطن میں جھانکا گیا ہے اور اس طرح اس کے کئی مخفی گوشوں کو سامنے لاکر اس کی نئی تفہیم کی گئی ہے۔

اردو میں غالب وہ شاعر ہیں جن کے ہاں شخصی اور فکری سطح پر تضادات ملتے ہیں اور ان کے اشعار میں جو پہلو داریت ہے۔ اس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے کئی حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر گنجینہ معنی کا طلسم کھلتا ہے اور اس طلسم اور اس طلسم کے کھولنے کا اسم اعظم نفسیات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کے پاس ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نفسیات کی چابی سے غالب آتش زیر پا۔ غالب کی شاعری میں جنس جیسے مضامین نفسیاتی تنقید کی اہم ترین مثالیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیاتی نتائج نے جہاں غالب کے اشعار کی صحیح اور حقیقت پسندانہ تفہیم کو سامنے لایا ہے وہاں غالب کی شاعری سے یقینی طور پر پہلی بار حظ اٹھانے کا موقع بھی فراہم ہوا ہے، غالب کے ہاں جنسی کمزوری کا احساس اور نظارہ پرستی کا جو رویہ تلاش کیا گیا ہیوہ ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے اسی طرح غالب کے ہاں پابوسی کا جو رجحان ملتا ہے اس کے تمام تر محرکات کو بھی سامنے لایا گیا ہے اور غالب کی یہ تصویر غالباً پہلی بار سامنے آئی ہے اور غالب کے کئی گوشوں کے در پہلی دفعہ وا ہوئے ہیں اور اس سے غالب کے بارے میں مباحث کے نئے دریچے کھلے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا نفسیاتی رویہ ان کی زیر طبع کتاب

"جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین کے مندرجات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد افسر ساجد کی یہ رائے وقیع ہے کہ اردو تنقید کو نفسیاتی ژرف بینیوں سے ہم آہنگ کر کے انہوں نے ایک نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کے اس جائزے سے ایک طرح ان کے تنقیدی کام کی نوعیت اور قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے کہیں پر بھی نفسیات کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں کہیں نفسیاتی عمل کی ضرورت محسوس ہوئی وہیں پر ہی نفسیات کی دھار استعمال کی اور نفسیات کو

کبھی بھی اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید کا اگر خلاصہ بیان کیا جائے تو اس کا خاکہ کچھ یوں بنتا ہے۔

(ا) ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید ان کے بے پناہ مطالعے، تجربے، مشاہدے اور عمق و تجزیے کی آئینہ دار ہے۔

(ب) ڈاکٹر سلیم اختر لاشعور کی اہمیت پر زور دینے کے باوجود شعور کی برتری کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

(ج) ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی زبان بوجھل اور جناتی نہیں اور کثافتوں سے پاک ہے چونکہ وہ تخلیقی فن کار ہیں اور خاص طور پر افسانہ نگار اس لئے ان کی تنقید میں چاشنی ہے اور اس میں دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

(د) ڈاکٹر سلیم اختر محض بنے بنائے نتائج پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اتفاق و اختلاف کے بعد اپنے ذاتی نتائج پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(ر) ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت سے زیادہ فن پارے کی اہمیت وافادیت پر زور دیتے ہیں اور اس کے مطالعے سے اپنی تنقید کو آگے بڑھاتے ہیں۔

(س) ڈاکٹر سلیم اختر بے تعصبی اور جرات مندی سے اپنی تنقیدی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔

(ف) ڈاکٹر سلیم اختر تنقید میں بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور کسی کی پروانہیں کرتے اس لئے ان کے تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی ادبی دیانت پر سو فیصد اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(ن) ڈاکٹر سلیم اختر اردو کے متنازع نقاد ہیں اور وہ بھی اپنی تحریروں اور تنقید کے بل بوتے پر۔

(و) ڈاکٹر سلیم اختر تخلیقی تنقید کے قائل ہیں اور وہ تخلیقی محرکات پر نظر رکھتے ہیں۔

(ی) ڈاکٹر سلیم اختر تنقید میں محتاط رویوں کے قائل ہی نہیں ان پر عمل بھی کرتے ہیں اور یوں لوگوں کو ناراض کرتے رہتے ہیں۔

اس تناظر میں ڈاکٹر سلیم اختر کی ناقدانہ صلاحیتوں کا برملا اظہار کیا گیا ہے بقول عرش صدیقی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اردو زبان کے ان چند اہم ترین ادباؤ میں شامل ہیں جنہوں نے اردو ادب اور زبات کی تحقیق کے سرمائے میں قابل قدر قابل ذکر اور زندہ رہنے والے اضافے کرنے کے ساتھ ساتھ اردو تنقید کی بعض نیم بیدار روایات کو تازگی اور توانائی اور بعض ناپختہ روایات کو پختگی عطا کی اور بعض نئی جہات کی نشاندہی کے ذریعے اردو تنقید کے لئے باب دریافت کئے"۔

اردو تنقید کے نئے باب دریافت کرنے سے عرش صدیقی کی مراد نفسیات ہی سے ہے کہ جس میں

اب ڈاکٹر سلیم اختر بہرحال حرف آخر ہیں۔ اور نفسیاتی تنقید کا معتبر و مستند حوالہ!

ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو تنقید کو نہ صرف نفسیاتی تنقید کی راہوں پر چلایا بلکہ فرائیڈ و یونگ اور ایڈلر کے افکار و خیالات سے بھی روشناس کرایا۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر سلیم اختر اردو کے ایسے نفسیاتی نقاد ہیں جن کی تحریروں نے غور و فکر کے نئے زاویے روشن کئے ہیں اور ابھی ان کا تنقیدی سفر جاری ہے جو یقینی طور پر اردو میں نفسیاتی تنقید کی ترویج کا باعث بننے کے ساتھ اسے اعتماد بخشے گا۔

سوچ کی بے حرف لو کا شاعر

مجید امجد کی غزل اسلوب اور لفظ و معنی کے اعتبار سے بہت سے قد آور غزل گوؤں کے دیوانوں پر بھاری ہے۔

اردو غزل کا ہر شعر بذات خود ایک پوری نظم ہوتا ہے۔ ہر شعر میں معنی کی اتنی پرتیں اور تہیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں کہ قاری کو ان تہوں تک پہنچنے کے لئے سوچ کے گہرے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجید امجد ایسا غزل گو شاعر ہے جس نے اردو غزل کو ایک سوچ عطا کی ہے اس کی غزل میں ایک نیا آہنگ ولب ولہجہ اور تنوع موضوعات کے استعمال کا عکس فنی رچاؤ کے ساتھ ملتا ہے کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے لاتعداد موضوعات جن تک عام ذہنوں کی رسائی ممکن نہیں۔ مجید امجد ان تک کس طرح پہنچتے ہیں یہ تو وہ خود ہی بتا سکتے تھے مگر ان کا ہر شعر اس بات کی دلیل بن کر ابھرتا ہے کہ اس نے موضوع کا پورا گیان حاصل کر کے اسے الفاظ کا ملبوس پہنایا ہے۔

جب اک چراغِ راہ گزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لَو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

میں کا لفظ جب شعر میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں ایک کائنات کی وسعت ہوتی ہے۔ مجید امجد کسی حرف یا کسی لفظ کا خلاق نہیں۔ وہ لفظوں کو موضوع یعنی جذبے اور تخیل کے اعتبار سے ترتیب دیتا ہے اور اس طرح لفظ و معنی کی علامتیں ہوتی ہیں جنہیں شاعر کی شاعرانہ بصیرت نیا رنگ دیتی ہے۔ شاعر کی ذات تنہا نہیں رہتی بلکہ معاشرے اور کائنات کا حصہ بن کر ابھرتی ہے۔ مجید امجد کی غزل کا موضوع بھی زندگی کے کرب و نشاط اور اس کے دکھ سکھ کے خمیر سے بنا ہے مگر انفرادی تجربے کے باوجود اجتماعی شعور نمایاں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔

روح کے دربستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
اور بھی اس جلوہ زارِ رنگ و بو میں گھومیئے

کنجِ دوراں کو نئے اک زاویے سے دیکھیے
جن فضاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومیئے

چاندنی نیم وا دریچہ--- سکوت
آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے
ہائے وہ لوگ خوب صورت لوگ
جن کی دھن میں حیات گزری ہے

مجید امجد اپنے غم کو پورے فنی شعور و آگہی کے ساتھ اجتماعیت عطا کرتا ہے اور پوری کائنات کو اپنے غم میں سمیٹ لیتا ہے اور یہ دکھ اور غم پوری کائنات کے غم کے پس منظر میں ابھرتا ہے۔

تیرے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو تیرا غم
طلوعِ مہر--- شگفتِ سحر--- سیاہیِ شب
تیری طلب تجھے پانے کی آرزو تیرا غم
نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے تیرا روپ
پلک جھکی تو میرے دل کے روبرو ترا غم

پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کر لینا نادانی ہے۔ کبھی تو ان کی استعمال سے بڑا حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن کبھی وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتی ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ کیونکہ زندگی کی نئی حقیقیں نئے طریق اظہار اور انداز بیان کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس مطالبے کو مجید امجد نے نئی امیجری اور نئے استعارے استعمال کر کے پورا کیا ہے۔ تخلیقی عمل کے المیے کو لے لیں یا سائنس کے اس کلیے کو کہ ہر چیز اپنے مرکز کی طرف لوٹتی ہے یا جسے سائنسی اصطلاح میں زمین کی کششِ ثقل کہا جاتا ہے۔ اس کو مجید امجد نے اس خوبصورتی اور جمالِ بیان کے ساتھ الفاظ کی لڑیوں میں پرو دیا ہے کہ اردو شاعری اس کا جواب نہیں لا سکتی۔ اور اس سے مجید امجد کے سائنسی شعور کا پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل میں بھی سائنسی شعور کا پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل میں بھی سائنسی افکار بیان کئے جا سکتے ہیں۔

پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے

نشیب زینہ ایام پہ عصا رکھتا
میں دیکھتا تھا اچانک یہ آسمان پہ کرے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے

مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ مجید امجد واقعی اردو نظم کا بہت بڑا شاعر ہے اور اس کے سامنے بہت سے قد آور شاعر بھی بونے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اردو نظم کی طرف بہت توجہ دی ہے اور ہیت کے علاوہ موضوعات کے اعتبار سے بھی نت نئے تجربے کیئے ہیں مگر اردو غزل اس کی بے توجہی کا شکار رہی ہے اور اس کا غزل کا سرمایہ کم ہے۔ اتنے کم غزلیہ سرمائے کے باوجود جو موتی اس نے اردو غزل کے دامن میں ڈال دیئے ہیں ان کی درخشندگی اور چمک کبھی بھی زنگ آلود نہیں ہو سکتی اور اس کی غزل کے اکثر اشعار بڑے شاعروں کے دیوانوں پر بھاری ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی اور لفظ و معنی کے اعتبار سے بھی۔

مجید امجد نے ایسے مختلف النوع اور ان کہے موضوعات اردو غزل میں سموئے ہیں کہ اس کے علاوہ دوسروں کی ہوائے خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہجر و وصال اور درد و فراق کا موضوع اردو غزل کے لئے نیا نہیں مگر نئی معنویت کے ساتھ جب یہ مجید امجد کی غزل میں در آتا ہے تو حرف و صوت اور لفظ معنی کے نئے شگوفے کھلتے ہیں۔ نازک خیالیوں کی نئی نویلی کلیاں وجود میں آتی ہیں۔ اور مجید امجد کی غزل کی دنیا کیوڑے کا بن معلوم ہوتی ہے جس میں بے پناہ خوشبو بھی ہے۔ نوکیلے کانٹے بھی ہیں۔ اور خوبصورت زہریلے سانپ بھی۔

غموں کے سبز تبسم سے کنج مہکے ہیں
سے کے سم کے ثمر ہیں میں اور کیا رکھتا
ہوا کے سایوں میں ہجر اور ہجرتوں کی وہ خواب
میں کاش دل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا
پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس
فاصلوں کی فصیل سے ابھرا
رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس
پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا

سنی جو بات کوئی ان سنی تو یاد آیا
وہ دل کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی
جھکیں جو سوچتی پلکیں تو میری دنیا کو
ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی

وقت مجید امجد کے ہاں ایک اہم Factor کے تناظر میں اجاگر ہوتا ہے۔ گزرتے لمحوں میں پناہ تلاش کرنے کی بجائے مجید امجد لمحہ موجود اور پھر لمحہ فردا کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ بیتی رتوں کی کہانیاں ضرور بیان کرتا ہے کہ روایت یہی ہے اور ان سے رابطہ ہونا بھی چاہیے مگر روایت سے وہ اس طرح بغاوت کرتا ہے کہ کائنات کی وسعتوں میں لمحہ فردا کا سراغ لگانے کی جستجو کرتا ہوں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں ان بیتے دن کی منتظر ہیں۔ اور وہ اس خاص دن کو بھی جو سورج کی راکھ میں غلطاں ہے انہی دنوں کی تہوں سے نکال کر دیکھنے کا متمنی ہے۔

اس ایک دن کو۔۔۔ جو ہے عمر کے زوال کا دن
اسی بدن میں نمویاب کون دیکھے گا
یہ ایک سانس جھمیلوں بھری جگوں میں رچی
اس اپنی سانس میں کون اپنا انت دیکھے گا

مجید امجد یہاں تنہائی اور اداسی کی گھمبیر ماحول میں دبی ہوئی راکھ سے چنگاری تلاش کرتا ہے مگر یاسیت اور رجائیت کے ملے جلے اظہار کے ساتھ

ہزار چہرے خود آرا ہیں کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا
ترخ کے گرد کی رو سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی۔۔۔ کوئی تو کہے گا۔ کون دیکھے گا

اس طرح مجید امجد اپنی غزل کی بے حرف لویں جلاتا اور الفاظ کا تیل استعمال کر کے انہیں بخشتا ہے۔ یہاں مایوسیاں و تنہائیاں اور اداسیاں بھی اس کا گھیراؤ کرتی ہیں۔ مگر وہ ان میں ڈوب کر بھی باہر نکل آتا ہے۔ پت جھڑ کے اداس اور بے رنگ موسموں کی گرد بھی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ شگفتگی کے گلاب کھلاتا ہوا اردو غزل کو مسرت اور شادمانی کے ہفت رنگ موسموں کا سندیسہ دیتا ہے۔ اور یوں انسانی حوالے سے زمین و آسمان اس کے ہاں ایک افق پر ملتے دکھائی دیتے ہیں اور پھر یوں وہ غزل کو ابدی لہجہ عطا کر کے خود

اسی مٹی میں رچ بس جاتا ہے جس کی خوشبو اس کے سارے بدن میں پھیلی ہوئی تھی اور جس کے چند جھونکوں نے اردو غزل کے آنچل کو بھی لہرا کر گلی گلی اور نگر نگر آوارہ کر دیا ہے اور وہ صدا یوں ابھرتی ہے۔۔

بنے یہ زہر ہی وجہ سفا جو تو چاہے
خرید لوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے
یہ زرد پنکھڑیاں جن پہ حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو توچاہے
تجھے تو علم ہی کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا۔۔ تو کیا۔۔ جو تو چاہے

اور یوں اردو غزل کو ایک نیا آہنگ دے کر مجید امجد ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا ہے اور اس کی یہ بشارت صداقتوں کی آئینہ دار ہے کہ

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

اور آج اس کے مرقد پر سدا بہار تر و تازگی لئے ہوئے گلاب کے پھول کھلے ہیں وہ مر کر بھی زندہ ہے اور اس کی شاعری اسے کبھی بھی مرنے نہیں دے گی۔ مگر کون جانے۔۔۔ شاید وقت اس بات کی ضمانت دے۔۔۔ کیونکہ وہی میزانِ عدل ٹھہرا ہے۔

غمِ صبحِ طرب کا شاعر

ہمارے سماجی نظام کی بنیاد ناانصافی پر ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس آسائش اور اطمینان کا سرمایہ ضرورت سے زیادہ ہے اور کچھ اپنی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ ایسے حالات میں انسان جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس میں آدمی آدمی کا دکھ جدا ہے۔ نظریاتی کشمکش ہے۔ اقتصادی جنگ ہے۔ سیاسی استبداد ہے مگر انسان میں استبداد کی زنجیریں توڑ دینے کا ولولہ ہے۔ اور یوں ترقی پسند تحریک کا منشور بھی سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنے پر مرکوز تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا خاتمہ۔ عوام کی بالادستیوں مزدور کسان کے معاشی مسائل کا حل اس کے مقاصد تھے۔ ظہور نظر کی شاعری بھی اسی محور کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انسانی وجود کا المیہ اس کی نظموں کا موضوع ٹھہرتا ہے۔ اس کی نظموں کے تناظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس دھرتی کو سنوار کر انسانی زندگی کے دکھوں میں کمی کر دی جائے۔ ظہور نظر نے اپنی نظموں میں نعروں سے کام لینے کی بجائے زندگی کے المیوں پر زیادہ زور دیا ہے وہ خود پکار اٹھتا ہے۔

میں شاعر ہوں۔

میں نے جو محسوس کیا ہے جو دیکھا ہے وہی کہا ہے۔

چاہے وہ دکھ ہو یا سکھ۔

ظہور نظر کی نظموں میں اس دکھ اور سکھ کا گہرا رچاؤ پورے فنی شعور کے ساتھ ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ظلم و استبداد کی زنجیریں مکڑی کا جالا سمجھتا ہے غیر ملکی استبداد کے خلاف انتقام اور نفرت کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ زندگی کے موڑ سے عہدِ نو کو دیکھنے کی خواہش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حالات کے اندھیرے سے بیزار ہے اس کے خلاف نبرد آزما ہے اور نئی روشنی کا منتظر:۔

سینۂ بحر پہ بل کھاتے جزیروں کی لکیر

کھولتے لاوں۔۔ بھرتی ہوئی موجوں سے اٹھا جس کا خمیر

جہدِ آزادیِ آدم سے چمک اٹھتی ہے۔

حدتِ عظمتِ محنت سے دمک اٹھی ہے۔

اجنبی حلقۂ زنجیر پگھلنے ہی کو ہے۔

رات اب ختم ہے خورشید نکلنے ہی کو ہے۔ (جاگے جزیرے)

ظہور نظر کی نظمیں پڑھتے ہوئے بعض اوقات بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نظموں کے پڑھنے سے ذہن کے کینوس پر جو مفہوم ابھرتا ہے غور کرنے پر اس کی صورت کچھ اور ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شعور اور احساس کے رچاؤ کے ساتھ جو فنی بصیرت ظہور نظر مین پیدا ہوئی ہے وہ کئی سانچوں میں ڈھل کر اپنا اظہار چاہتی ہے اور اس اظہار کے لئے سیدھا سادہ اسلوب نہیں بلکہ علامتوں کی ضرورت ہے اور یہ علامتیں فن پارے کو وسیع تر بنا دیتی ہیں۔

کیا لکھوں
کیا لکھ سکتا ہوں۔
تیری موت پہ!
تیری موت کو میری موت ہے
اپنی موت پہ اپنا نوحہ کس نے لکھا ہے
لیکن میں یہ سب کچھ کیسے سوچ رہا ہوں!
میں تو تیرے ساتھ مرا تھا
میں تو تیرے ساتھ لحد میں دفن ہوا تھا (کتبہ)

ہیروشیما ۔۔۔۔ ناگاساکی کی آہیں ۔۔۔۔ آخری جنگ کی کالی خونی راہیں۔
ایک دیس کے ایک نگر کے لوگوں کی جبری تقسیم ۔۔۔۔ برلن ۔۔۔۔ کوریا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔
ویت نام ۔۔۔۔ لاؤس ۔۔۔۔ کشمیر ۔۔۔۔ ٹھنڈی جنگ کا خون آلودہ گرم دھواں ۔۔
خوفناک ہتھیاروں کی بے منزل دوڑ ۔۔۔۔ راکٹ ۔۔۔۔ راڈر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
میزائیل ۔۔۔۔ میگاٹن بم ۔۔۔۔۔ چین عراق اور مصر کی آزادی کا گیت ۔۔۔۔۔۔۔
افریقہ کی زنجیریں ٹوٹنے کٹنے کی جھنکار ۔۔۔۔ الجیریا کے جانبازوں کی للکار اور اس جیسے بہت سے دوسرے موضوعات کی یگانگت کا احساس ظہورِ نظر کو جغرافیائی حدوں میں محدود نہیں ہونے دیتا اور وہ اپنے ملک سے باہر بھی انسانیت کو کرب میں مبتلا دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے وہ انقلاب پسندوں کا ہمدرد ہے کیونکہ یہ عہد کا تقاضا ہے۔ ہر انقلاب اس کے دل میں امید کی کرن پیدا کر دیتا ہے۔

فتح سویز ۔۔۔ انقلابِ عراق ۔۔۔۔ موجِ صدا ۔۔۔۔ جنگِ الجزائر ۔۔۔۔۔۔

غمِ جہاں اسی اظہار اور سوچ کو لے کر سامنے آتی ہیں۔ وہ مفلس طبقے کو مالدار طبقے کے خلاف آمادہ جنگ کرنے

کی سعی کرتا ہے۔ مزدور اور کسان کا انفرادی کرب اجتماعی کرب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ نظم "میں تیرا کون ہوں"۔ میں یوں اظہار کرتا ہے؟

اور مرا جرم میری خطا میری تقصیر گر کوئی ہے تو فقط یہ کہ میں
لہلہاتے ہوئے کھیت کی مینڈھ پہ
بھوک کی لو میں دہقان کو جلتا ہوا دیکھ سکتا نہیں
رات دن زرا گلتے ہوئے کارخانوں میں مزدور کو
خون اگلتا ہوا دیکھ سکتا نہیں
ذہن و دل علم و فن نغمہ و شعر پر
کالے قانون کا راج چلتا ہوا دیکھ سکتا نہیں

اس اجتماعی کرب میں کبھی کبھی انفرادی کرب کے تار بھی حرکت کرنے لگ جاتے ہیں اور شاعر کی انفرادی کسک غم واندوہ کا پرتو لئے ابھرتی ہے اس کا اظہار آخر شب میں پوری طرح ہوتا ہے۔

وہ سرد جھونکا
جو میرے ہمراہ رات بھر گھومتا رہا ہے
سحر کے ہنستے ہی مسکرا کر۔ نظر بچا کر۔ تیری طرح دور ہو گیا ہے
بڑی رفاقت، بڑی محبت سے جاتے جاتے
تیری طرح وہ بھی میری پلکوں میں چند موتی پرو گیا ہے
یہ چند موتی یہ چند قطرے یہ چند آنسو
کہ عمر بھر کی وفا شعاری کا غم گساری کا ماحصل ہیں
نہ جاں فزا ہیں نہ جاں گسل ہیں
انہیں بہادوں انہیں لٹا دوں کہ روک لوں چشمِ منتظر میں
یہ کشمکش یہ سوال یہ دکھ کسے سناؤں
رفاقتوں سے فگار سینہ سوائے تیرے کسے سناؤں

ظہور نظر اپنی اکثر نظموں میں تنہائی اور کربِ تنہائی کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ غم و آلام کو ایک بے کراں سمندر سمجھتا ہے۔ زمانے نے اسے اتنے دکھ دیئے ہیں کہ اب کسی پر بھی اسے اعتبار نہیں رہا۔ یہاں وہ

قنوطیت کا شکار نظر آتا ہے اس پر یاسیت کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہے۔ حتی کہ وہ تنہائی بھی جس کا وہ محصور ہے اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور یوں اسے اپنے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ خلوص و مہر و محبت کی تمام تر اقدار اسے مٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی نظموں سچا جھوٹ، شب وعدہ، گجر، اعتراف، شکست سے پہلے، شکست، نارسائی اور فاتحہ میں اس کے ذاتی اور انفرادی غم کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ظہور نظر خود کو انسانوں سے کٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی انسان اس کی طرف توجہ دیتا ہے۔ معاشرے کے اس حیرت انگیز انقلاب پر وہ ماتم کرتا ہے اور کرب تنہائی کو ختم کرنے کے لئے ریشم کے پردوں، آویزاں تصویروں اور کتابوں کو آواز دیتا ہے۔ نظم ایک دوپہر، دیکھیئے ۔

بند گلی میں گھوم کے جانے والے جھانکو
میرے گھر کے کھلے کواڑوں سے ٹکراؤ
دروازے کے اترے چہروں سے مت چپکو
گہرے نیلے ریشم کے پردو لہراؤ
دیواروں پر آویزاں تصویرو اترو
الماری میں سوئی کتابو آؤ
تنہائی بھی مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہے
آؤ میرے جلتے پہلو میں سو جاؤ

اس کے باوجود وہ جس حسن کا عمر بھر متلاشی رہا ہے اور جو اپنی خوبصورت یادیں چھوڑ گیا ہے۔ اس کے فراق میں درد کے سائے کچھ اور پھیلتے جاتے ہیں۔ اور پچھلی شبوں کی طرح شاعر یہ رات بھی جاگتے گزارتا ہے۔، دیارِ دل اور شام میں یہی منظر سامنے آتا ہے۔ ۔

ذرا سی یاد کے سائے بہت طویل ہوئے
گلی گلی میں گھنا۔ گہرا درد پھیل گیا
کرِن کرِن میں کئی دھڑکنیں غروب ہوئیں
قدم قدم سے گزر کر غموں کا سیل گیا
ترے بغیر ہی یوں تو کٹی ہے عمر تمام
مگر یہ شام یہ بیرن سلگتی جلتی شام

کٹی ہے ایسے کہ جیسے رگِ حیات کٹے
یقین نہیں ہے کہ اب اس کے بعد رات کٹے

ظہور نظر کی یہ نظمیں جن میں ایک رات، آخر شب، تنہائی، شب خون، نئی گلی، کوئٹہ کی ایک رات اسی تناظر میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ظہور نظر کی نظم "اے غمِ صبح طرب" جس میں وہ اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔ نو اور ظلمت، ظلم اور عدل، امیر و فقیر، سرمایہ دار و مزدور اور جاگیر دار و کسان کی باہمی آویزش سے اس کے دل پر جس طرح چوٹ پڑتی ہے۔ اس احساس کا رچاؤ اسے چین نہیں لینے دیتا۔ وہ ظلمت کی اس چادر کو تار تار کر دینا چاہتا ہے۔ پوری دنیا سے ناانصافی کا نام تک مٹا دینا چاہتا ہے اور صبح طرب کے اس غم میں وہ خود بھی سلگتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لرزیدہ ہاتھوں کو ملتے ہوئے صرف یہ کہہ رہا ہے کہ اس زندگی میں کسی کو بھی ایفائے عہد کا یارا نہیں اور یہ زندگی غموں کا ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارا ہی نہیں۔ ظہور نظر کو انسان، کائنات اور اعلیٰ انسانی اقدار سے بے پناہ محبت ہے اس کی محبت کا دائرہ وسیع ہے۔ گھر وطن اور پوری انسانیت اس میں سما گئی ہے۔ اس کی نفرت بھی شدید ہے اور یہ نفرت انسان سے نہیں بلکہ ظلم و استحصال اور ریا کی قوتوں سے ہے۔

شب ۔۔۔۔

کہ ہے دیدہ پرخوں کی طرح خون سے تر
شب کہ ہے قبر کی آغوش سے بھی تیرہ و تار
شب کہ ہے چہرہ بیمار کی مانند اداس
شب کہ ہے دامِ قضا تختہ دار
ہر طرف آہ و بکا چیخ و پکار
اب تو اشکوں سے بھر بیزار ہوا دیدہ زار
اے غمِ صبح طرب
کس طرح رو کے گزاروں گا یہ شب

مختلف ملکوں میں پابندیوں کا ذکر کرنے کے بعد ظہور نظر یوں اظہار کرتا ہے۔

میں کہ ہوں حسن کا دیوانہ محبت کا نقیب
میں کہ ہوں بادِ سحر گاہ کا گیت
میں کہ ہوں درد کی رگ رگ میں تڑپتی ہوئی لے

میں کہ ہوں دکھ سے سلگتے ہوئے دل کا سنگیت
میں کہ ہوں جاگتے انسان کا میت
اے غم صبح طرب
کس طرح سو کے گزاروں گا یہ شب

ان حوالوں سے ادب اور شاعری کی بھیڑ میں ظہور نظر کی آواز صاف پہچانی جاتی ہے اور ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کا لیبل اس پر نہیں لگ سکتا۔ اور نہ ہی اس کی شاعری آؤٹ ڈیٹڈ کیلنڈر معلوم ہوتی ہے اور یوں اس کی آواز شاعری کی زندہ آواز ہے۔ کیونکہ جذبے کی صداقت اس کی شاعری کو کبھی مرنے نہیں دے گی۔

میں شاعر ہوں
جو بھی میں محسوس کروں گا
جو دیکھوں گا وہی کہوں گا
چاہے وہ دکھ ہو یا سکھ

شہر سدا رنگ کا شاعر

شاعری اس روایتی دیو کی طرح ہے جس پر اگر آپ تلوار سے حملہ کر دیں، تو لہو کی ہر بوند سے ایک نیا دیو پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے شاعری کے دیو سے نپٹنے کے لئے صرف ایک ہی صورت باقی رہتی ہے کہ اسے آپ نگل جائیں چنانچہ اس صورتِ حال میں جن شاعروں نے شاعری کے اس روایتی دیو کو نگلنے کے بعد شاعری کو نئی ہیت کے ساتھ لفظ و معنی کی شکل میں اجاگر کیا ہے۔ ان میں ہیر دیس کا مست ملنگ شاعر شیر افضل جعفری سرفہرست ہے۔ شیر افضل جعفری نے نئے الفاظ کے ساتھ اردو شاعری کو جو نیا اسلوب اور لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا رنگ منفرد بھی ہے اور ناقابل تقلید بھی۔ وہ اکلاپے کا مسافر لاتعداد مخالفتوں کے باوجود ونجھلی کی تان پر جھومتا مسکراتا گیسوئے اردو کو سنوارتا سنگارتا اپنی منزل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اور چناب رنگ کے قافلے اردو غزل کی ترقی کی جانب ٹور رہا ہے۔

مصور رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے اس کو الفاظ کے ذریعے سرانجام کرنے کی صنعت کا نام شاعری ہے اور بقول جانسن " شاعری اگر مترنم خیالات کا اظہار ہے تو غزل سے بہتر کوئی ہیت اس شعری جذبہ کے اظہار کی نہیں" شیر افضل جعفری چونکہ حقیقی غزل گو کے مزاج کا حامل ہے۔ اس لئے اس نے اردو غزل ہی میں اپنے لئے امکانات پیدا کئے ہیں اس نے اردہ غزل کو علاقائی ٹچز دے کرنئی جہتیں عطا کی ہیں۔ بقول سلیم اختر " ہمعصر غزل میں الفاظ سے وابستہ تجربات بہت اہم ہیں مثبت اور منفی ہر دو اثرات کی بنا پر شیر افضل جعفری نے مضمون کے لحاظ سے اپنی غزل کو ہیر کا تختہ ہی نہیں بنایا۔ بلکہ علاقائی زبانوں کے بے شمار خوبصورت اور برمحل الفاظ کے شاعرانہ استعارات سے اسلوب کے امکانات میں اضافہ کیا۔ ان کا یہ تجربہ جائز حدود میں رہتا ہے اس لئے ان کی غزلوں کا اثر خوشگوار ہوتا ہے"۔

اس اعتبار سے شیر افضل جعفری نے نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات بھی دیئے ہیں اور اسلوب کی نئی سمتوں سے اردو غزل کو روشناس کرایا ہے اس نے اردو غزل کیلئے اپنی غزل سے ایک نیا چراغ روشن کیا ہے اور نئے چراغوں کی ضوفشانی کے لئے سامان فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل کھلیانوں سے لے کر شبستانوں تک ہر جگہ مقبول ہے۔ شیر افضل جعفری چونکہ خالصتۂ غزل کا شاعر ہے اس لئے اس نے حسن و محبت کے واقعات کو دل کی دھڑکنوں اور ہمہ گیر شعوری رو میں رچا بسا کر اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے اور اس میں نمایاں چیز تخلیقی شعور اور اپنے عہد کی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل میں عام

انسانوں کی خوشیوں اور دکھوں کا عکس ملتا ہے اس نے اس سرزمین کے گیت گائے ہیں اور الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے کھیتوں اور شاہراہوں پر اس کی زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ اسے سنبل وریحان میں وہ حسن دکھائی نہیں دیتا جو کپاس کے پھول، گندم کی ڈالی، دھان کے کھیت نرل ندیوں، سرسوں کے خیابان ساون کی خوشبو، چیت کے نکھار، درختوں کے بور اور زمین پر اگی ہوئی کھمبیوں میں نظر آتا ہے۔

شیر افضل جعفری نے نئے الفاظ کے جو نگینے جڑے ہیں اور جس طرح علاقائی زبانوں سے پیوندکاری کی ہے۔ اس میں اسے لاتعداد مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اور اس کے اپنے دیس کے باسی بھی اس کا ادبی بائیکاٹ کرنے کی دھمکیاں دیتے رہے مگر وہ یہ کہہ کر آگے بڑھتا رہا ؎

عشق بالائے دار جا پہنچا
زندگی ڈالتی رہی ڈورے
یہ محبت کی سلطنت ہے یہاں
سانولوں کے غلام ہیں گورے

شیر افضل جعفری اپنی منزل کی طرف سرد سرد آہوں کے قافلے تاروں کی چھاؤں میں ٹورتا رہا۔ اور دل کو مکران کے بلوچوں کی ڈاچیوں پر نثار کر کے ہیر دیس سے داغ داغ لے لے کر زندگی کو سنگارتا اور سنوارتا رہا۔ اور ان کو حسرت کے ساتھ برداشت کر کے یہ کہا ؎

رانجھا ہوں مرے کان میں ہے عشق نے ڈالا
لہرا کے غزل گا کے چڑھے چاند کا بالا
تو نے دل ویران کو عطا کی ہیں بہاریں
اے دوست تری جھوک بھی آباد ہو شالا

شیر افضل جعفری اپنی غزل میں جو صنعتیں، استعارے، تلمیحات اور علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ سب کی اپنی علاقائی ثقافت کو اجاگر کرتی ہیں۔ وہ مانگے تانگے کی اشیاء کے قائل نہیں۔ وہ ایسی زندگی کی حرکت، روشنی اور خوشبو کے قائل ہیں جس میں علاقائی رنگ جھلکتا ہے ؎

ایام کے جلتے ہوئے صحرا کی فضا میں سے
سورج کے الاؤ سے کنول مانگ رہا ہوں
پانی کو ترستی ہوئی دھرتی کے خدا سے

رو ہی کا پنپتا ہوا تھل مانگ رہا ہوں
سسی کی طرح وقت کے بھنبور تھلوں میں.
بے رحم بلوچوں سے پنل مانگ رہا ہوں

شیر افضل جعفری کلاسیکل غزل کا سہارا نہیں لیتا اور نہ ہی وہ حسرت کی طرح کوٹھے پر آنا یاد کا ورد کرتا ہے۔ اس کا موضوع اگر چہ حسن و عشق ہی ہے مگر نئے رنگ کے ساتھ، نئی خوشبو کے ساتھ وہ حسنِ دیہات اور حسنِ فطرت کی بات کرتا ہے۔ میک اپ سے بے نیاز دوشیزہ ململ کے پتلے سے دوپٹے کی بکل مارے کوٹھے کی چھت پر اپنے محبوب کو آتا ہوا دیکھتی ہے اور جب بالائے بام آئی ہوئی محبوبہ کو عاشق کی نظریں پا لیتی ہیں تو حسن حقیقی کا ایک کوندا لپکتا ہے اور شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ۔

ململ کی ڈونگی بکل میں
لج پال . بشارت چھلکی ہے
اس بت کی ماڑی پر افضل
کعبے کی زیارت جھلکی ہے

مہاتما بدھ کے مطابق زندگی دکھوں کا گھر ہے اور زندگی غم و الم سے مرتب ہے غمِ جاناں اور غمِ دوراں نے انسان کو جو کسک بخشی ہے اس کا اظہار جعفری کی غزل میں بھی ابھرتا ہے اس کا غم انفرادی نوعیت کا نہیں بلکہ اجتماعی ہے وہ اپنے گاؤں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہے۔ اس کی آواز الفاظ کے سانچے کا یوں روپ دھارتی ہے ۔

زندگی ہے چنار کا بوٹا
جی جھلنے لگا ہے چھاؤں میں
دل میں اترا ہے یوں غمِ دوراں
جس طرح جیٹھ آئے ۔ گاؤں میں

وہ غم سے گھبراتا نہیں بلکہ جوش کے الفاظ کی قدر و قیمت سے واقف ہے کہ غم خدا کا عطیہ ہے اس لئے اسے سینے سے لگا کر رکھو۔ چنانچہ وہ غم کو اپنی کائنات سمجھتا ہے اس لئے بھی کہ غم سے ہی ابدی مسرت کا سراغ ملتا ہے وہ غم والم سے عاری لوگوں کو مذہب عشق سے نابلد سمجھتا ہے ۔

غم جس کا ایمان نہیں ہے
وہ کسی کا خان نہیں ہے

اور غم ہی میں وہ عزت وتوقیر سمجھتے ہوئے اسے اپنی پہچان بنالیتا ہے ۔

مجھ پنوں سے تھل جنگل میں
کوئی بھی انجان نہیں ہے

شیر افضل جعفری غم سے اس قدر لگاؤ رکھتا ہے کہ چاند کی خنک چاندنی بھی اسے مسرت عطا نہیں کرتی دکھ اور کرب کا احساس پورے فنی شعور کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے مگر کرب ناکی، یاسیت اور قنوطیت سے کوسوں دور ہے۔ ۔

زندگی غم کی حور ہے یارو
کربلا کی کھجور ہے یارو
جھوک آباد ہے محبت کی
شاخ سوزاں پہ بور ہے یارو
آپ کی زلف کے اندھیرے بھی
چاندنی کی مثال ہوتے ہیں
چاند جب روح میں کرنوں کو چھبو دیتا ہے
سنگ دل وقت بھی بے ساختہ رو دیتا ہے
جیٹھ کی رات کے آنچل کو سلگتا شاعر
جھلملاتے ہوئے اشکوں سے بھگو دیتا ہے
دل کے پورب سے ابھرتا ہے جھلکتا ہوا داغ
چاندنی شامِ غریباں میں سمو دیتا ہے

وقت کی سوکھتی جھیلوں میں کنول پیت نہیں
زندگی کونج کی فریاد ہے سنگیت نہیں
چاند خاموش ہے آکاش پہ سناٹا ہے
آج تاروں کی زبان پر بھی کرن گیت نہیں

شیر افضل جعفری زندگی کے حادثات وآلام کو اس کا لازمہ سمجھتا ہے اور ان سے پیار کرتا ہے زندگی کی

ہر لغزش سے اسے محبت ہے وہ زندگی کے درد کو سمجھتا ہے اور اس سے مسرت کے پہلو نکال لیتا ہے اور ہر حال اور ہر صورت میں جینا چاہتا ہے۔

میرے پاس تہی دستی ہے درویشی ہے
یہ دولت کب شہزادوں کے ہات لگی ہے
میں انسان کو موت کا دلہا کہتا ہوں
مجھ کو ماتم کی ٹولی بارات لگی ہے

لیکن اسے دل کی اس بارات کے لٹ جانے کا شدید دکھ ہے جس طرح باؤلے سویرے نے ڈسا ہے اور اس کے دل کے اجڑے کھنڈر پر آرزوؤں کی سوکھی سوکھی گھاس اگی ہے وہ اس کے من کا روگ بن کر احساسِ محرومی کا سوانگ بھر کر سامنے آتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے۔

دل کبھی سہر سدا رنگ ہوا کرتا تھا
اب تو اجڑے ہوئے ڈیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر وقت اس بات کی بشارت دے رہا ہے کہ اگر اردو شاعری زندہ رہے گی تو غزل کے ساتھ رہے گی اور غزل رہی تو شیر افضل جعفری کا نام جلی حروف میں لکھا ہوگا اور وہ غزل کے ابدی مینار پر بیٹھا کہہ رہا ہوگا۔

جیٹھ آیا بھی گیا بھی لیکن افضل جعفری
دل کی ساندل بار میں اب تک نہ پیلو پکیاں

گفتگو میں لہجہ مطربانہ کا شاعر

قتیل شفائی کے فن اور شاعری کی ان گنت جہتیں ہیں اور ہریالی سے لے کر چھتنار تک کا ریاضت فن کا سفر بلاشبہ قتیل شفائی کی ذہنی اپج کا آئینہ دار ہے اور اردو شاعری کا برگد بے مثال، اس کے فنی اور ذہنی سفر کی ایک کڑی " گفتگو میں قتیل شفائی ایک نئے روپ میں سامنے آیا ہے اور عداوتوں کے نام نہاد پیکروں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی قتیل شفائی اردو غزل کا لاجواب شاعر ہے اور غزل کی صحت مند روایات کا عکس پورے عصری شعور کے ساتھ " گفتگو" کی غزلوں میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے " گفتگو" قتیل شفائی کی شاعری کی نمائندگی بھرپور انداز میں کرتی ہے۔ قتیل شفائی نے غزل میں دردوغم کی چاشنی سموئی ہے کہ یاسیت کسی طور پر بھی دستکیں نہیں دیتی بلکہ نغمگی اور طرب ناکی کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ غم کی خنک چھاؤں میں جو منظر نامہ تخلیق ہوتا ہے اور اس سے جس طرح درد کے جزیرے ابھرتے ہیں۔ وہ بہرحال اجلے موسموں کی خبر دیتے ہیں۔

مل جل کے برہنہ جسے دنیا نے کیا ہے
اس دور نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے
پھیلا ہے تیرا کرب قتیلؔ آدھی صدی پر
حیرت ہے کہ تو اتنے برس کیسے جیا ہے
جھونکوں سے بجلیوں کی بشارت بھی پائیں گے
ہم لوگ موسموں کے ولی بن کے آئیں گے
محنت کبھی کسی کی اکارت نہیں گئی
اک بوند بوئیں گے تو سمندر اُگائیں گے

علامت آج کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ بات درست ہے کہ علامتیں معنوی حسن کو اور بڑھا دیتی ہیں مگر یہ جمالیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب علامت کا پورے طور پر ابلاغ ہو جائے قتیل شفائی علامتوں کے خلاف نہیں ہے مگر اس نے جان بوجھ کر علامتوں کے استعمال سے گریز کیا ہے کیونکہ علامتیں حقیقت نگاری سے دور لے جاتی ہیں اور اس طرح حقیقت کے پردے میں اپنے تجربات اور وارداتِ قلبی کی باتیں کی ہیں۔

بقول سلیم اختر " گفتگو کی غزلیں قتیل شفائی کے فن میں ایک نئی جہت کی نشان دہی کرتی ہیں اور ان غزلوں میں ایک نیا قتیل نظر آتا ہے"۔

کیا عشق تھا جو باعثِ رسوائی بن گیا
یارو تمام شہر تماشائی بن گیا
بن مانگے مل گئے مری آنکھوں کو رت جگے
میں جب سے ایک چاند کا شیدائی بن گیا
برہم ہوا تھا میری کسی بات پر کوئی
وہ حادثہ ہی وجہ شناسائی بن گیا

اسلوب کے الجھاوے اور علامتوں کے طلسماتی کڑے قتیل شفائی کو پسند نہیں حالانکہ وہ علامتوں کی خوبصورتی کا دل سے قائل ہے۔ وہ قاری سے ابلاغ کا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اور اسے بھول بھلیوں میں دھکیلنا نہیں چاہتا۔ وہ خود بھی اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ "لہجہ اور موضوعات خلائی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق زمین میں پھیلی ہوئی رنگا رنگ زندگی ہی سے ہے اور یہ شاعری انہیں انسانوں کے لئے کی گئی ہے جو اس کے کردار بھی ہیں اور قاری بھی۔۔ اور جو خلا میں نہیں۔۔ زمین پر بستے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجے میں بات کرنا بہت بڑی ناانصافی ہے اگر زمین سے ہمارا ناطہ نہیں ٹوٹا تو ہمیں اس کی مٹی کی مزاج سے آنکھیں نہیں پھیرنا چاہئیں"۔

چنانچہ اس کی شاعری میں اس کی کہی ہوئی باتوں کا پورا پورا عکس ملتا ہے اور وہ غیر زمینی لہجے میں بات نہیں کرتا۔ اس دور کے انسانوں کے دکھ درد کی بات کرتا ہے استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل کے لمحوں کا کرب بے کراں شاعرانہ رعنائیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس کے ہاں گھنے سایوں کا جنگل ہے جس میں سائے حرکت کرتے ہیں اور ان میں غزل کے بنیادی وصف تغزل کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے غزل کو گیت کی زبان دی ہے چنانچہ قتیل شفائی کی غزل میں جھانجھنیں بجتی ہیں چوڑیاں کھنکتی ہیں۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو
میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو
مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی

یہ تیری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو
خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تو نے اگر میرے حوالے مجھ کو

قتیل شفائی چونکہ ایک ترقی پسند شاعر ہے اور اس نے ترقی پسند تحریک کا بھی بھرپور ساتھ دیا ہے اس لئے اس کی غزلوں میں بغاوت، احتجاج اور معاشرتی بدحالیوں، بدعنوانیوں، بے انصافیوں، محرومیوں اور جبر و تشدد کے خلاف آواز ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ انسانوں کے غیر انسانی رویے کے خلاف بھی احتجاج کرتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے۔

اے دوست تیری آنکھ جو نم ہے تو مجھے کیا
میں خوب ہنسوں گا تجھے غم ہے تو مجھے کیا

اس شعر میں جو گہرا طنز پوشیدہ ہے اس کی کاٹ وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہے قتیل شفائی راہبروں کے بھیس میں رہزنوں کا بھی علم رکھتا ہے اور وہ ان سے وہی سوال کرتا ہے اور ان کا ہی دامن پکڑ کر صداقتوں کے علم اٹھا کر کہتا ہے۔

ہم کو پاسبانوں سے برملا یہ کہنا ہے
کب تلک ہمیں آخر قاتلوں میں رہنا ہے

قتیل شفائی استحصالی قوتوں کے رویے پر گہرے طنز کا اظہار کرتے ہوئے ان کی سازشوں کو بے نقاب کرتا ہے اور یوں وہ بظاہر انفرادیت کا لہجہ اختیار کر کے اجتماعیت کی بات کرتا ہے اور اس کے کرب سے ہر مظلوم کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اس دور میں توفیق انا دی گئی مجھ کو
کس جرم کی آخر یہ سزا دی گئی مجھ کو
میں نے جو کیا فصل بہاراں کا تقاضا
اک پھول کی تصویر دکھا دی گئی مجھ کو
کچھ نام لکھے ہی تھے ابھی میرے قلم نے
کاغذ کی طرح آگ لگا دی گئی مجھ کو

قتیل شفائی کے ہاں کچھ باتیں اردو غزل کی روایت سے ہٹی ہوئی ملتی ہیں اور یہ اس کا کریڈٹ بنتا

ہے کہ اس نے ان کہے مضامین کہے ہیں کہ وہ اردو غزل کے لئے اجنبی ہیں۔ غزل کی روایت میں رقیب کو برا بھلا کہنا اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ اس سے فرار نہیں مگر نئے دور کا شاعر ان مفاہیم کو بھی بدل کر رکھ دیتا ہے وہ محبت کے وسیع تر معنی لیتا ہے وہ ذات کی نہیں بلکہ حالات کی بات کرتا ہے اور یہی رویہ قتیل شفائی کا بھی ہے وہ کہتا ہے۔

وہ جب سے گیا شہر میں ہے قحط رقیباں
اس شہر کی رونق تھی اس شخص کے دم سے

چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیل
جو ہاتھ بے قصور تھا وہ ہاتھ کٹ گیا

مجھ میں رچی ہوئی تیری خوشبو تھی اس لئے
بڑھ کر عدو بھی مجھ سے بغل گیر ہو گیا

قتیل شفائی کی یہ غزلیں پڑھ کر جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے زبان و بیان اور لب و لہجے کو لطیف احساسِ جمال کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی مختلف جہتوں اور سطحوں پر گہری نظر اور مشاہدے کی وسعت کے باعث اس کی غزل میں بلا کی وسعت گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے جس میں فن کا گہرا رچاؤ بھی شامل ہے اور اس کا رنگ غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے موضوعات کی اس متنوع قوسِ قزح میں قتیل شفائی نے اپنے فن کو معیار سے نہیں گرنے دیا اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے ہر بار ایک نیا قتیل شفائی ابھرتا ہے جو دلوں کی برف کو عارضوں سے شناخت کرتا ہے اور یوں غزل سرا ہوتا ہے۔

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے

قتیل شفائی غزل کو خوب صورت لہجہ عطا کرتا ہے اور یہ لہجہ مطرباز ہے اس لئے بھی کہ رجائی اور

جمالیاتی نقطہ نظر اس کی شاعری کی بنیاد ہے اور اس طرح کہ اردو غزل قتیل شفائی کے ذہن پر چھم کر کے اتری ہے اور اسے یوں طاقت گویائی ملی ہے کہ ۔

تھکی انا کا سفر کہاں تک کہیں تو رک جا کہیں تو دم لے
بنا دیا ہے مسافتوں نے ترے ہی قدموں کی دھول تجھ کو
یہ ریزہ ریزہ سی آرزو میں کبھی تو کر دے مرے حوالے
میں اپنے بکھرے بدن کی مانند دہکتا ہوا ملوں تجھ کو

قتیل شفائی کی غزل کے بارے میں فیض صاحب نے یہی لکھا ہے کہ " قتیل صاحب ایک ایسا منفرد رنگ رکھتے ہیں جس میں قریب قریب سب رنگوں کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن رنگارنگی کے باوجود ان کا کلام یک رنگ ہے۔ اس یک رنگی میں لہجے کو بھی دخل ہے اور معانی کو بھی اور ان کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہے "۔ اور یوں قتیل شفائی کی غزل کے اس مختصر جائزے سے اس کی فنی عظمت پورے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے اور اب بھی اگر کچھ لوگ اس بات کو تسلیم نہ کریں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ان کے دلوں پر قفل لگا دیئے ہیں اور چابیاں گہرے سمندروں میں پھینک دی ہیں۔ شاید یہ اشعار انہیں احساس دلا سکیں۔

منزل جو میں نے پائی تو ششدر بھی میں ہی تھا
جھانکا تو اپنے خول کے اندر بھی میں ہی تھا
آخر مجھے پناہ ملی اپنے آپ میں
رقصاں ہو جس میں روح وہ پیکر بھی میں ہی تھا

اور اردو غزل کی تاریخ اس لہجے کو کب فراموش کر سکتی ہے ۔

میں نے پوچھا پہلا پتھر مجھ پر کون اٹھائے گا
دنیا بولی سب سے پہلے جو تجھ سے شرمائے گا

اس طرح یہ بات واقع سچ ہے کہ قتیل شفائی کی غزل ایک نئی جہت کی علامت بنتی ہے اور اس میں اس کا رشتہ انسانوں سے نہیں ٹوٹتا اور قتیل شفائی کا یہ قول اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک سچا فن کار ہے اور اس نے فلمی گیتوں میں بھی ادبی چاشنی پیدا کر کے اپنے لئے ایک منفرد رنگ پیدا کیا ہے قتیل شفائی کہتا ہے۔

لفظوں کی گٹھڑیوں کو سروں سے اتار کر
لوگ اب قتیل میری غزل گنگنائیں گے

مطالعہ فرید کے دس سال

ڈاکٹر طاہر تونسوی

غالبیات اور اقبالیات کی طرح فریدیات نے بھی ایک مستقل اصطلاح کی شکل اختیار کر لی ہے یہ الگ بات کہ فریدیات کی مد میں بہت کم کام سامنے آیا ہے حتیٰ کہ ابھی تک دیوانِ فرید کا صحیح متن بھی سامنے نہیں آ سکا۔ یہی حال خواجہ فرید کے فکر و فن کی تفہیم کا ہے۔ تاہم حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ خواجہ فرید صدی کے آغاز ہی سے فریدیات کی جانب اہل نقد و نظر نے توجہ دینا شروع کی ہے اور لمحۂ موجود میں اس نے تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سرائیکی وسیب سے تعلق رکھنے والے اہل قلم اور لوگ خواجہ فرید خواجہ فرید کی مالا جپتے رہتے ہیں اور ان کی کافیوں کو پڑھ کر یا سُن کر سر دھنتے رہتے ہیں مگر تفہیم فرید کے سلسلے میں ہمارا اگراف بہت نیچا ہے اور المیہ یہ ہے کہ اب تک خواجہ فرید کے سوانح کے بارے میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو مستند حوالے کا کام دے سکے۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال خاصی افسوس ناک اور حیرت انگیز بھی ہے اور پھر گورنمنٹ کے اداروں اور خاص طور پر محکمہ اوقاف نے تو اس جانب دھیان ہی نہیں دیا حالانکہ یہ ان کی قومی ذمہ داری ہے کہ اپنے بجٹ کا معتد بہ حصہ اولیائے کرام کے افکار و نظریات کے پرچار کے لئے وقف کرے اور اہلِ علم سے کتابیں لکھوا کر شائع کرے تا کہ ان کی تعلیمات اور دینی خدمات سے آگاہی ہو سکے مگر انہیں تو اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ بہر حال اب اس صورتِ حال میں انقلابی تبدیلی آئی ہے اور وہ بھی عوامی سطح پر ...... سرائیکی دانشوروں میں بھی اب یہ احساس بڑھا ہے کہ خواجہ فرید کو عالمی سطح پر روشناس کرانے کی ضرورت ہے اور ان پر بکھرے ہوئے کام کی شیرازہ بندی کر کے اسے موضوعات کے اعتبار سے یکجا کر کے تفہیم فرید کے مشن کو آگے بڑھایا جائے۔ گزشتہ دس برسوں میں مطالعۂ فرید کی اس روایت کو خاصی توانائی ملی ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ مطالعہ پاکستان کے ایک

طالب علم خورشید عالم نے ۱۹۸۹ء میں ''پاکستان میں مطالعۂ فرید کی روایت'' کے عنوان سے ڈاکٹر انوار احمد کی نگرانی میں ایم اے کی سطح کا مقالہ لکھا تھا جس میں اردو، سرائیکی، پنجابی، سندھی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں خواجہ فرید کے بارے میں لکھی گئی تحریروں کی ایک ببلوگرافی درج کی گئی ہے اور ۱۹۸۹ء تک خواجہ فرید کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کا مختصر جائزہ بھی قلمبند کیا گیا ہے۔ تاہم اس میں ابھی کافی گنجائش موجود ہے اور اس کی وجہ مطلوبہ مواد تک رسائی ہے پھر بھی یہ ایک اچھی کوشش ہے جو حوالے کا کام دے گی۔ ۱۹۹۹ء میں خواجہ فرید صدی کے تناظر میں سرائیکی ادبی بورڈ ملتان نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا ہے تاکہ فریدیات سے دلچسپی رکھنے والے دانشور اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے ہوگا۔

اس تناظر میں ضروری ہے کہ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۹ء تک مطالعۂ فرید کے جو دس سال بنتے ہیں اس دوران شائع ہونے والی فریدیات کے موضوع پر کتب پر نظر دوڑائی جائے تاکہ اس کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں آسانی بھی پیدا ہو اور ایک واضح شکل بھی سامنے آجائے۔

کلامِ فرید

دیوانِ فرید — مولانا عزیز الرحمٰن عزیز۔

بار اول: ۱۹۴۴ء
بار دوم: ۱۹۶۳ء
بار سوم: ۱۹۸۶ء
اردو اکادمی بہاولپور
بار چہارم: ۱۹۹۵ء
اردو اکادمی بہاولپور

آکھیا خواجہ فرید نے، محمد آصف خان

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور
۱۹۹۴ء، بار دوم ۱۹۹۹ء

دیوانِ فرید (عزیز الرحمٰن عزیز) مرتب جاوید چانڈیو — سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور
۱۹۹۸ء

دیوانِ فرید — مرتب قیس فریدی — جھوک پبلشرز خان پور
بار اول ۱۹۹۲ء
بار دوم ۱۹۹۵ء
بار سوم ۱۹۹۶ء
بار چہارم ۱۹۹۸ء
بار پنجم ۲۰۰۰ء

دیوان فرید — (حبیبی) — جھوک پبلشرز خان پور ۱۹۹۷ء

فریدی کافیاں — مرتبہ دلشاد کلانچوی — اکادمی سرائیکی ادب بہاولپور
۱۹۹۱ء

فریدی ڈوہڑے — مرتبہ احسان اعوان — دلچسپ سرائیکی سنگت جندو پیر کمال
لیاقت پور ۱۹۹۷ء

انتخاب کافیاں خواجہ غلام فرید — عزیز پبلشرز لاہور ۱۹۹۶ء

کلام خواجہ غلام فرید — فیضان اکیڈمی لاہور ۱۹۹۹ء

خواجہ فرید دے ڈوہڑے — سلیمان برادرز ملتان

خواجہ فرید دیاں چند مترجم کافیاں — جھوک پبلشرز ملتان ۱۹۹۹ء

شخصیت/فکر و فن

خواجہ غلام فرید حیات و شاعری — مسعود حسن شہاب — اردو اکادمی بہاولپور بار اول ۱۹۶۳ء
بار دوم ۱۹۷۳ء
بار سوم ۱۹۹۴ء

سخن فریددا	رحیم طلب	سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور ۱۹۹۱ء
عظیم صوفی شاعر خواجہ غلام فرید	عبدالعزیز اختر شمیم	شمیم پبلیکیشنز رحیم یار خان ۱۹۹۴ء
فریدیات	دلشاد کلانچوی	اکادمی سرائیکی ادب بہاولپور ۱۹۹۵ء
خواجہ فرید دے تعلیمی نظریات	ظفر لاشاری	پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور ۱۹۹۵ء
تعلیمات تصوف حضرت خواجہ غلام فرید	علامہ دین محمد عباسی	کوثر کتب خانہ اوچ شریف س۔ن
خواجہ غلام فرید شخص اور شاعر	جمیلہ درانی	بیکن بکس ملتان ۱۹۹۶ء
ذکرِ فرید	محمد اسلم میتلا	میتلا پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء
انوارِ فرید	محمد اسلم میتلا	میتلا پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء
کلامِ فرید اور مغرب کے تنقیدی زاویے	خورشید ناظر	اردو اکادمی بہاول پور ۱۹۹۶ء
رمز فریدی	علامہ محمد اعظم سعیدی	جھوک پبلشرز ملتان ۱۹۹۸ء
Dimension of Khawaja Farid's Metaphysics	ڈاکٹر شہزاد قیصر	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۱۹۹۸ء
عکسِ فرید	مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۱۹۹۹ء
پاکستان میں مطالعۂ فرید کی روایت	خورشید عالم	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۱۹۹۹ء
فکر فراق فریدی	مرتبہ مہر گل محمد	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۱۹۹۹ء

کون فرید فقیر	دلشاد کلانچوی	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۱۹۹۹ء
فرید نامہ	محمد اسلم میتلا	بزم ثقافت ملتان ۱۹۹۹ء
سلک سلوک فریدی	مرتبہ حمید الفت ملغانی	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۲۰۰۰ء
Selected Kaffies of Khawaja Farid	مرتبہ عامر حفیظ ملک	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان ۲۰۰۰ء
خواجہ فرید اور ان کا خاندان	طاہر محمود کوریجہ	الفیصل ناشرین لاہور
ہفت اقطاب	حضرت مولانا محمد غلام جہانیاں	مکتبہ معین الادب ڈیرہ غازی خان ۱۹۹۵ء
کون فرید فقیر	تصنیف شہزادہ احمد اختر تلخیص خواجہ معین الدین کوریجہ	خواجہ فرید ٹرسٹ کوٹ مٹھن ۱۹۹۹ء
احوال وواقعات خواجہ فرید	خواجہ معین الدین کوریجہ	جھوک پبلشرز ملتان ۱۹۹۹ء
فتوحاتِ فریدیہ (ترجمہ فوائدِ فریدیہ)	میر حسان الحیدری	سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور ۱۹۹۸ء
حضرت خواجہ غلام فرید حالاتِ زندگی کشف وکرامات	مولانا نور احمد فریدی	جھوک پبلشرز ملتان ۱۹۹۹ء
گوہر شب چراغ	محمد انور فیروز	سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور ۱۹۹۹ء
خواجہ فرید	تصنیف مرزا احمد اختر ترتیب وحواشی مقدمہ جاوید چانڈیو	سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور ۱۹۹۹ء

مقابیس المجالس	مولانا رکن الدین	
(ملفوظات)	مرتبہ کیپٹن واحد بخش سیال	الفیصل ناشرین لاہور
تناظراتِ فرید	ترتیب وتہذیب عائذہ قریشی	سرائیکی ادبی بورڈ ملتان ۲۰۰۰ء

کتب میں ذکرِ فرید

خواجہ غلام فرید دی شاعری	التا...... قاسم جلال	ادارہ تعمیرِ فکر بہاول پور ۱۹۹۲ء
سرائیکی کافی دا سفر خواجہ فرید تک، خواجہ فرید فن تے شخصیت کلامِ فرید دی صحت	تر کہ...... نواز کاوش ویورے...... صدیق طاہر	سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور ۱۹۹۲ء سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور ۱۹۹۲ء
خواجہ فرید کی اردو شاعری کا فکری تناظر، خواجہ فرید کی آفاقی شاعری دیوان فرید کی اشاعتِ ثالث، فریدیات میں استناد کی روشن مثال	لمحۂ موجود۔ ادب اور ادیب ...... ڈاکٹر طاہر تونسوی	مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۲ء
خواجہ فرید کے کلام وچ عشقیہ داستاناں، خواجہ فرید دے کلام وچ ریتاں	سرائیکی ادب ریت تے روایت ...... ڈاکٹر طاہر تونسوی	بیکن بکس ملتان ۱۹۹۳ء

خواجہ غلام فرید، ہجر فراق اور درد والم کا شاعر	پنجابی کے پانچ قدیم شاعر ...... شفیع عقیل	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی بار اول: ۱۹۷۰ء، بار دوم: ۱۹۹۴ء
خواجہ فرید کا جمالیاتی مطالعہ فریدیات اور شہاب دہلوی	تحسین ...... حسین سحر	کتاب نگر، حسن آرکیڈ ملتان، ۱۹۹۷ء
خواجہ فرید کا مذہب	مقالاتِ فلسفہ ...... ڈاکٹر محمد امین	بیکن بکس ملتان ۱۹۹۴ء
خواجہ غلام فرید	سرائیکی شاعری ہک مطالعو (سندھی) ...... ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو	ادبی سوسائٹی بدین ۱۹۹۹ء
1. Iqbal & Kh. Ghulam Farid on Man God Polarity. 2. The quitntessence of Kh. Ghulam Farid' Metaphysics 3. The uniqueness of Kh. Ghulam Farid's Metaphysics	Metaphysics & Traditions ...... ڈاکٹر شہزاد قیصر	گورا پبلشرز لاہور۔ ۱۹۹۸ء

اس فہرست کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ خواجہ غلام فرید پر کس نوعیت کا کام ہوا ہے۔ اس دوران رسائل اور اخبارات میں چھپنے والے مضامین کی فہرست الگ ہے جو میری کتاب ''مطالعۂ خواجہ فرید کے دس سال'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ محولہ بالا تو ایک طرح کا اجمالی جائزہ ہے تاکہ خواجہ فرید کی شخصیت، ان کے فکر وفن اور ان کے کلام پر تحقیقی و

تنقیدی کام کی نشاندہی ہو جائے اور اس بات کا بھی علم ہو جائے کہ ہم سرائیکی وسیب میں بسنے والے تمام لوگ جو ہر وقت، ہر لحظہ اور ہر دم خواجہ فرید، خواجہ فرید کی مالا جپتے رہتے ہیں انہوں نے عقیدت سے قطع نظر اس عظیم صوفی شاعر کے کلام اور پیغام کی تشہیر کے لئے تحریری طور پر کیا کچھ کیا ہے یا قومی وطیرہ کے حوالے سے محض تقریروں میں خواجہ فرید کی عظمت کے گن گا کر کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات درست ہے کہ خواجہ فرید کے فکر وفن کا جو چرچا گزشتہ دس برسوں میں ہوا ہے اس کی مثال پہلے نہیں ملتی اور پھر خواجہ فرید صدی کے سلسلے میں نہ صرف فریدیات میں کام کی رفتار بڑھی ہے بلکہ اس کا گراف بھی اونچا ہوا ہے۔ یوں خواجہ فرید کا فکر وفن اپنی تمام تر تشریحات کی روشنی میں اور نکھر کر سامنے آیا ہے اور فرید فہمی کا ایک نیا باب کھلا ہے۔ اجمالی طور پر منتخب کتب کا تعارف پیش کرتے ہیں تا کہ ایک واضح شکل سامنے آجائے اس جائزے میں موضوع کی اہمیت کے حوالے سے کتابوں پر گفتگو ہو گی۔

''خواجہ فرید اور ان کا خاندان'' طاہر محمود کوریجہ کی تحقیقی کتاب ہے۔ طاہر محمود کوریجہ کا تعلق خانوادۂ فرید سے ہے اور یوں عقیدت ومحبت کے ساتھ ساتھ ان کی یہ ذمہ داری بھی بنتی تھی کہ ان کے خاندانی نوادرات میں خواجہ فرید کے بارے میں اور ان کے خاندانی حالات کے سلسلے میں (شجرہ نسب، قلمی دیوان، ملفوظات وغیرہ) جو مواد موجود ہے اس کی روشنی میں وہ ایک مستند حوالہ جاتی کتاب سامنے لائیں۔

طاہر محمود کوریجہ ایک باشعور اور صاحبِ نظر ادیب ہیں اور لکھنے پڑھنے سے خاصا شغف رکھتے ہیں انہوں نے اس بات کا قوی تر احساس کرتے ہوئے یہ کتاب تالیف کی جس میں انہوں نے موجود مواد سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کتاب کو لمحۂ موجود کا عظیم تخلیقی کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس کتاب سے ان کا تبحر علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کا بھی عملی ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب سچائی کا ایک ایسا مرقع ہے جو صدیوں تک رُشد وہدایت کا فیض پھیلاتی اور عام کرتی رہے گی اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔ بقول دلشاد کلانچوی

''تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک بیش بہا خزانہ ہے
جس میں روزنامہ کائنات بہاولپور ۲۶ مارچ ۱۹۹۷ء کے مطابق اس
میں بزرگانِ کوریجہ کے کئی سو سال پرانے خطوط اور نادر و نایاب
رنگین تصاویر اور مغل بادشاہوں کے فرامین کے عکس بھی شامل ہیں۔''

ڈاکٹر محمد امین نے روزنامہ نوائے وقت ۱۳ مئی ۱۹۹۷ء میں اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''خواجہ طاہر محمود کوریجہ کا اندازِ تحریر پُرکشش اور اثر آفریں ہے۔
ادبی چاشنی کا لطف بھی ہے۔ اس اسلوب نے اس خشک تحقیقی کتاب کو
دلچسپ بنا دیا ہے۔ محقق نے بڑی ریاضت اور عرق ریزی سے کام کیا
ہے۔ انہوں نے محض خاندانی روایات پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ ان کی
حمایت میں حوالے اور دلائل بھی فراہم کئے ہیں۔ میری محدود
معلومات کے مطابق خواجہ فرید کے خاندانی حالات کے بارے میں
یہ پہلی معلومات افزا اور تحقیقی کتاب ہے۔''

''خواجہ فرید اور ان کا خاندان'' پانچ سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے جس کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب: قیام عرب کے دوران کوائفِ بزرگانِ فاروقی۔ دوسرا باب: آلِ عمر کی سندھ آمد۔ تیسرا باب: سندھ سے مٹھن کوٹ ہجرت۔ چوتھا باب: ذکرِ فرید۔ پانچواں باب: خانوادہ فرید اور اس کے بزرگان (بعد و تا حال) .... اس حوالے سے یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے کہ جس میں خواجہ فرید کے بعد کے بزرگان کے حالاتِ زندگی اور ان کے صوفیانہ مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے اور اسے حال تک مکمل کیا گیا ہے۔ تاریخی لحاظ اور زمانی اعتبار سے اس کی ضرورت بھی تھی اور اس کتاب کا تقاضہ بھی تھا جسے خواجہ طاہر محمود کوریجہ نے بطریقِ احسن پورا کیا ہے۔ اس پس منظر میں ''خواجہ فرید اور ان کا خاندان'' ہر لحاظ سے اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ ''فریدیات'' میں نئے مباحث کے در کھولتی ہے۔

"کون فرید فقیر" خواجہ فرید کے مرید اور خادم خاص شہزادہ احمد اختر کی جو بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے اور آخری ایام میں خواجہ فرید کے ساتھ رہے کتاب مناقب فریدی کی تلخیص ہے جسے خواجہ معین الدین کوریجہ نے زیور طباعت سے آراستے کرایا ہے۔ اس میں خواجہ فرید کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ خاندان فرید کی چاچڑاں سے جلاوطنی کا احوال بھی درج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ ایک بحث طلب کتاب کا روپ دھار لیتی ہے۔

"گوہر شب چراغ": ابوسعید محمد انور فیروز بہاول پوری کی تصنیف ہے جو خواجہ فرید کی وفات کے بعد ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۸۹ء میں اور تیسری بار ۱۹۹۹ء میں چھپی۔ اس میں خواجہ غلام فرید کے حالاتِ زندگی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ شاعری پر تبصرہ اور کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ آخر میں منتخب کافیوں کا فرہنگ بھی شامل ہے۔

"احوال و واقعات حضرت خواجہ غلام فرید": خواجہ معین الدین کوریجہ نے اس کتاب میں حضرت خواجہ غلام فرید کے احوال و واقعات اور شخصی معلومات درج کی ہیں۔ اس میں خواجہ فرید کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی صفات، فیاضی، سیر چشمی اور استغنا وغیرہ کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے فلسفۂ وحدت الوجود، نظریۂ عشق، عشقِ رسولؐ، دنیا کی بے ثباتی، ہجر و فراق اور نظریۂ فطرت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں خواجہ معین الدین کوریجہ کی باتیں کے عنوان سے ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔

'تحفت اقطاب": حضرت مولانا محمد غلام جہانیاں معنوی قریشی کی تالیف ہے جس میں سلسلۂ چشتیہ کے بزرگانِ دین کا احوال درج ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ غلام فرید کے حالاتِ زندگی، تصوف میں ان کے مقام و مرتبہ، کشف و کرامات اور ان کے ملفوظات کو تفصیل سے احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے اور پھر خواجہ غلام فرید کی اولاد کے بارے میں بھی تذکرہ موجود ہے۔ یوں دیکھا جائے تو یہ کتاب بنیادی ماخذ کا درجہ قرار پاتی ہے۔

"خواجہ غلام فرید حیات و شاعری": مسعود حسن شہاب کی تالیف ہے جو ۱۹۹۴ء

میں تیسری بار اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ مسعود حسن شہاب ایک شاعر، صحافی، سفر نامہ نگار اور ماہر فریدیات کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں اور ۱۹۶۳ء میں ان کی شائع ہونے والی کتاب اب تک خواجہ فرید کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اہم اور مفید کتاب ہے جو خواجہ فرید سے عقیدت کا مظہر ہے۔ اس میں خاندان ونسب، خواجہ صاحب کی زندگی، خواجہ صاحب بحثیت شاعر، خواجہ صاحب کی زبان، خواجہ صاحب کی شاعری، تصوف اور خواجہ فرید، خواجہ فرید ایک سالک کے رنگ میں، خواجہ صاحب کا تصورِ عشق، خواجہ صاحب کے کلام میں مجازی رنگ، خواجہ صاحب کی بہاریہ شاعری، خواجہ صاحب کی فنی خوبیاں اور کافیوں کا منظوم ترجمہ اس کی اہمیت کو اور بھی اجاگر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ خواجہ صاحب کی اردو شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے جو تفہیم فرید میں شاندار کردار کی حامل ہے۔

''خواجہ فرید'': بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا احمد اختر کی پانچ نایاب تصانیف کا مجموعہ ہے جسے ترتیب، حواشی اور مقدمہ کے تناظر میں جاوید چانڈیو منظر عام پر لے آئے ہیں۔ اس کی بڑی اہمیت تو یہ ہے کہ پہلی بار ایک جلد میں پانچوں تصانیف مناقب فریدی حصہ اول، مناقبِ فریدی حصہ دوم، سفر نامۂ فریدی، کشف الخلافتہ اور سوانح عمری حضرت فرید ثانی ایک ہی جلد میں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں پہلی چار کتابیں خواجہ فرید کی حیات ہی میں چھپ گئی تھیں جبکہ پانچویں کتاب ان کی وفات کے ایک یا دو برس بعد منظر عام پر آئی۔ جاوید چانڈیو نے بڑی محنت اور ریاضت سے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ اسی طرح بڑی عرق ریزی سے حواشی بھی لگائے ہیں۔ یوں خواجہ فرید کی شخصیت کے بارے میں معاصر بنیادی ماخذات سامنے آ گئے ہیں اور فریدیات پر اس حوالے سے کام کرنے والوں کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ بلاشبہ جاوید چانڈیو کا یہ ایک کارنامہ ہے جس کی داد نہ دینا ناانصافی کے مترادف ہے اور یوں بھی کہ وہ تحقیق کے مردِ میداں ہیں اور اس کی باریکیوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا حق ادا کر دیا ہے اور نظروں سے اوجھل مواد کو یکجا کر دیا ہے۔

جاوید چانڈیو کا تذکرہ آیا ہے تو ان کے مرتب کردہ ''دیوان فرید'' کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس نے اسے تقابلی مطالعے اور حواشی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ مولانا عزیز الرحمن عزیز کے مرتب کردہ اس دیوانِ فرید میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی لغاتِ فریدی بھی شامل ہے۔ جاوید چانڈیو نے اسرارِ فریدی سے لے کر خواجہ فرید کے کلام کے تمام تر ماخذوں کو سامنے رکھا ہے اور اس کی تفصیل ابتدائیے میں دے کر اسے ان عنوانات کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

(۱) دیوانِ فرید

دیوانِ فرید ایک جائزہ
مختلف زبانوں کے اثرات
اشعار میں کتابت کی غلطیاں
فہرست کافیاں (ردیف وار)
متن دیوانِ فرید (مولوی عزیز الرحمن عزیز)
کتابت اور املا کی غلطیاں

(۲) دیوان فرید اور اسرارِ فریدی

کلامِ فرید کے مطبوعہ سرمائے پر ایک نظر
اسرارِ فریدی معروف بہ دیوانِ فریدی
اسرارِ فریدی کے پہلے چار صفحات کا عکس
تقابلی چارٹس

(i) مولانا عزیز الرحمن کے حاشیے اور اسرارِ فریدی۔ ۱
(ii) مولانا عزیز الرحمن کے حاشیے اور اسرارِ فریدی۔ ۲
(iii) دیوانِ فرید اور اسرارِ فریدی میں اختلافی الفاظ اور مصرعے
(iv) دیوانِ فرید اور اسرارِ فریدی میں کتابت اور املا کا اختلاف
(v) ضمیمہ

(۳) لغاتِ فریدی

لغاتِ فریدی اور سرائیکی لغات نویسی

لغاتِ فریدی کے چند وضاحت طلب الفاظ

لغاتِ فریدی...... ڈاکٹر مہر عبدالحق

ان توضیحات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جاوید چانڈیو نے عمیق اور گہرے تحقیقی شعور کے ساتھ دیوانِ فرید کو مرتب کر کے حواشی لگائے ہیں اور ایسے الفاظ کی املا کو بھی درست کر دیا ہے جو معانی و مفہوم کی راہ میں رکاوٹ تھے اور ایسے الفاظ کی جو سندھی زبان میں ایک الگ معنی رکھتے ہیں نشاندہی کر دی ہے۔ اس طرح خواجہ فرید کے کلام کی اصل روح تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔

''فتوحاتِ فریدیہ'' خواجہ غلام فرید کی تصنیف ''فوائدِ فریدیہ'' کا ترجمہ ہے جسے میر حسان الحیدری چانڈیو نے کیا ہے۔ اس سے قبل حضرت مولانا غلام جہانیاں معنوی قریشی بھی اس کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ میر حسان الحیدری نے ترجمے سے پہلے ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جس کے مطالعے سے اختلاف کے کئی پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ خود فوائدِ فریدیہ کو چھوڑ کر فتوحاتِ فریدیہ نام بھی کھٹکتا ہے۔ تاہم انہوں نے بڑی محنت سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یوں فریدیات کے ماہرین کے لئے دونوں ترجموں کو پیشِ نظر رکھ کر تقابلی مطالعے کا موقع مل جائے گا۔

''ذکرِ فرید''، ''انوارِ فرید'' اور ''فرید نامہ'' محمد اسلم میتلا کی فرید فہمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پہلی دو کتابیں سرائیکی میں اور تیسری کتاب اردو میں ہے۔ ذکرِ فرید میں جو ۲۱ مضامین شامل ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور ان میں خواجہ فرید کے فکر و فن اور ان پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کی تحریروں کی جانب محض اشارے کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ تاہم بعض موضوع نئے ہیں جن کی بنا پر ان کی کاوش و جستجو کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح خواجہ فرید کی شخصی اور تخلیقی زندگی کے نئے نئے گوشے اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے مواد کی فراہمی کو یقینی بناتے ہیں۔ اس طرح ایک نیا رنگ

اور کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ خواجہ فرید اور ملتان، خواجہ فرید اور بہاول پور، خواجہ فرید اور ڈیرہ غازی خان، فرید ایک عارفِ کامل، خواجہ فرید اور علم موسیقی، فرید اور حسینیت، کلامِ فرید اور سفرِ حجاز، خواجہ فرید اور لسانیات، فرید ایک نثر نگار، سفر فرید شناسی کا، فریدیات کا علمی سرمایہ جیسے موضوعات شامل ہیں۔

''انوارفرید'' میں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے۔ خواجہ فرید کا سفرِ ارادت، خواجہ فرید کا حلقۂ ارادت، خواجہ فرید اور عبادات، خواجہ فرید کا ذوقِ مطالعہ، خواجہ فرید کے ہمعصر سرائیکی شعراء، خواجہ فرید اور علامہ اقبال، کلامِ فرید کے منثور اور منظوم تراجم، خواجہ فرید کے دستخط اور دستاویزات یقینی طور پر فریدیات میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ بقول پروفیسر شوکت مغل:

> ''اسلم میتلا نے حیات و کلام فرید کی گتھیوں کو تحقیق اور پرچول کی کسوٹی پر لا کھڑا کیا ہے اور یہ فرید شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگی۔''

پروفیسر اسلم انصاری نے درست لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نئے اور اچھوتے مضامین و موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ نئے تحقیقی مواد کی فراہمی کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کا بھی حق ادا کیا گیا ہے۔''

''فرید نامہ'' میں ''ذکرِ فرید'' اور ''انوارِ فرید'' کے بہت سے مضامین کا اردو میں ترجمہ پیش کر دیا گیا ہے۔ البتہ کئی نئے اور انوکھے موضوعات پر بھی تحقیقی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ ایسے مضامین میں خواجہ فرید کا روحانی سفر، خواجہ فرید اور روہی، خواجہ فرید کی ہندی شاعری، خواجہ فرید کی سندھی شاعری، خواجہ فرید کی فارسی شاعری، خواجہ فرید کا فارسی کلام، دیوانِ فرید (ع) کا قلمی دیوانوں سے تقابلی مطالعہ، رسالہ العزیز اور فریدیات، فریدیات سرحد پار، فرید اور دوہے۔

ان تینوں کتابوں میں اختصار کی خوبی موجود ہے مگر تحقیقی حوالے اور حاشیوں سے

کام نہیں لیا گیا۔ اس کے باوجود فریدیت کے سلسلے میں مزید کام کرنے والوں کے لئے جو مواد محمد اسلم میتلا نے فراہم کر دیا ہے اسے ان کی فرید شناسی اور خواجہ فرید سے محبت کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نصر اللہ ناصر:

''یہ تصنیف فریدیات میں ایک انتہائی اہم اضافہ شمار ہوگی۔''

اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں، اس لئے کہ میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ محمد اسلم میتلا نے خواجہ فرید کے بارے میں جو معلومات اور مواد کی فراہمی کے لئے اپنی پوری صلاحیتیں وقف کر رکھی ہیں اور انہیں جب بھی اس مواد کے بارے میں علم ہوا ہے انہوں نے ہر طرح سے اسے حاصل کر کے فریدیات کے طالب علموں کے لئے مہیا کر دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ خدمت بھی انہیں فرید شناسوں کے قبیلے میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔

''سخن فرید دا'': رحیم طلب کے فریدیات کے سلسلے میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جس کا دیباچہ دلشاد کلانچوی نے تحریر کیا ہے۔ اس میں خواجہ فرید کا فکر و نظر، خواجہ غلام فرید کے کلام میں قرآن و حدیث، خواجہ فرید کا تصورِ عشق، خواجہ کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی اور استعارے دا ورتارا، محاورات اور اکھان جیسے مقالات شامل ہیں اور ان سے بلاشبہ خواجہ فرید کے فکر و فن اور ان کے کلام کی معنویت کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے تاہم ان میں گہرائی کا فقدان نظر آتا ہے پھر بھی ان کی اہمیت ضرور بن جاتی ہے۔

''فریدیات'': دلشاد کلانچوی کے خواجہ فرید کے کلام کے موضوعات کے بارے میں تحریر کردہ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں مکمل احاطہ کیا گیا ہے اور فکرِ فرید کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ ایم اے سرائیکی کے نصاب میں خواجہ فرید کا ایک الگ پرچہ ہے اس لئے یہ کتاب طالب علموں کے لئے خاصی مفید ہے اور لگتا بھی یہی ہے کہ دلشاد کلانچوی کے پیشِ نظر یہ مقصد تھا۔ تاہم فریدیات کے ادراک کے لئے یہ مضامین اہم ہیں۔

''خواجہ فرید دے تعلیمی نظریات'': ظفر لاشاری کا ایم ایڈ کا مقالہ ہے جس میں ان کے حالاتِ زندگی، سوانح، شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے اور چونکہ صوفی بھی ایک معلم ہوتا ہے اس حوالے سے ان کے طریقۂ تدریس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ مرشد

قرآن حدیث اور فقہ کے علاوہ ان سے متعلقہ مسائل کے بارے میں تشریحات وتوضیحات کا فرض بھی سرانجام دیتا ہے اور اپنے مسلک تصوف کی بھی تلقین کرتا ہے۔ان کے بقول:

''خواجہ فرید کی ساری شاعری تعلیمی موضوعات کا ایک خزانہ ہے۔''

ان کی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک ایسا نیا موضوع ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک ظفر لاشاری کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے جو فریدیات کے مطالعہ کی ایک نئی سمت دکھاتی ہے۔

''رمز فریدی'': علامہ محمد اعظم سعیدی کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں خواجہ فرید کی شاعری کے موضوعات روہی، وطن پیاس، پریم نگر وغیرہ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور جن زیورات کا تذکرہ خواجہ صاحب کے ہاں ملتا ہے اور جو اکھان اور محاورے انہوں نے استعمال کئے ہیں انہیں ایک الگ مضمون کی شکل میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اسی طرح خواجہ فرید کو پیامی شاعر اور جدوجہد کا پیامبر بھی قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔

''خواجہ فرید شخص اور شاعر'': جمیلہ درانی کی اس تالیف میں خواجہ فرید کا زمانہ، شاعری اور ان کا منتخب کلام درج ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب حضرت خواجہ فرید کے شخصی و تخلیقی دونوں پہلوؤں کا سیر حاصل احاطہ کرتی ہے اور مطالعہ فرید کے لئے مباحث کی نئی راہیں فراہم کرتی ہے اور یوں جمیلہ درانی کی محنت، ریاضت اور ذہنی اُپج کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کی خوبی کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ کتاب فریدیات میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ بقول ڈاکٹر اسلم عزیز درانی:

> ''جمیلہ درانی نے خواجہ فرید کی حیات اور شاعری پر بڑے سلیقے اور کاوش سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے خواجہ غلام فرید کی شاعری کے نئے گوشے اور نئے زاویے تلاش کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ خواجہ فرید کے کلام کی تفہیم وتعبیر کے لئے بھی عمدہ سعی کی ہے۔''

اس طرح یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود معیار کے لحاظ سے لائق تحسین ہے۔

خواجہ فرید صدی کے تناظر میں البتہ خواجہ غلام فرید کے فکر وفن پر تحقیقی وتنقیدی کام

میں تیزی آئی ہے۔ خاص طور پر سرائیکی ادبی بورڈ ملتان نے ایک جامع پروگرام کے ساتھ خواجہ فرید کے بارے میں کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور ایک ساتھ سات کتابیں شائع کی ہیں اور تین چار اشاعتی مراحل سے گزر رہی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ڈاکٹر شہزاد قیصر کی کتاب Dimensions of Khawaja Farid's Metaphysics ہے۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر نے خواجہ فرید کی مابعد الطبیعات پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ کتاب ان کے سات مضامین کا مجموعہ ہے جن میں پہلی بار خواجہ فرید کا اس زاویے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اس میں خواجہ فرید کے نظریۂ وحدت الوجود کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس تناظر میں یہ کتاب تصوف کے نظریات اور تصورِ وحدت الوجود کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ خواجہ فرید ابن العربی کے بعد وحدت الوجودی فلسفے کے سب سے بڑی داعی تھے۔

''عکس فرید'' ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتبہ کتاب ہے جس میں خواجہ فرید کی شاعری، فلسفے، فکر وفن اور دیگر موضوعات پر لکھے گئے بے شمار مضامین میں سے ۲۶ مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے اور بعض مضامین ازسرِ نو لکھوائے گئے ہیں۔

۱۔	خواجہ فرید	اسد ملتانی
۲۔	خواجہ فرید کی شاعری	سید علی عباس جلالپوری
۳۔	خواجہ فرید کی کافیوں میں تصوف کا پہلو	مولانا نور احمد خان فریدی
۴۔	خواجہ فرید	احمد ندیم قاسمی
۵۔	خواجہ فرید کی روہی	محمد کریم تونسوی
۶۔	خواجہ فرید ایک ہمہ اوستی شاعر	شریف کنجاہی
۷۔	خواجہ فرید کا استعاراتی نظام	ڈاکٹر مہر عبدالحق
۸۔	خواجہ غلام فرید کی اردو شاعری	شہاب دہلوی
۹۔	کلام فرید میں رجائیت کا پہلو	دلشاد کلانچوی

۱۰۔	شاعر محبت۔ خواجہ غلام فرید ی سا ئرں	آفاق صدیقی
۱۱۔	خواجہ فرید کا نظریہ غم	رفیق خاور جسکانی
۱۲۔	نغمۂ صحرا۔ خواجہ غلام فرید کی کافی	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۳۔	خواجہ غلام فرید کے نظریہ وحدت الوجود کے زاویے	ڈاکٹر شہزاد قیصر/ عامر حفیظ ملک
۱۴۔	خواجہ غلام فرید کی شاعری	صدیق طاہر
۱۵۔	کلام فرید کے تہذیبی خدوخال	ارشد ملتانی
۱۶۔	خواجہ غلام فرید کی شاعری کی معنوی قدروقیمت	ڈاکٹر اسلم انصاری
۱۷۔	خواجہ غلام فرید	قاضی جاوید
۱۸۔	خواجہ فرید کا ذوق سفر	طاہر محمود کوریجہ
۱۹۔	نورصحرا۔ خواجہ غلام فرید	ممتاز احمد سومرو
۲۰۔	کون فرید فقیر	ڈاکٹر نصراللہ ناصر
۲۱۔	خواجہ فرید کا اعجاز	اعزاز احمد آذر
۲۲۔	روہی رنگ رنگیلی	معین شہلا
۲۳۔	فرید کا مذہب عشق	ڈاکٹر محمد امین
۲۴۔	خواجہ فرید کا تصور حسن وعشق	جاوید احسن
۲۵۔	خواجہ غلام فرید ایک عظیم صوفی شاعر	پروفیسر فاروق فیصل
۲۶۔	نئے جہانوں کی تفہیم کا شاعر	ڈاکٹر طاہر تونسوی

مضامین کی فہرست سے موضوعات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شہناز نور نے ماہنامہ اظہار کراچی جنوری فروری ۲۰۰۰ء میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خواجہ غلام فرید ایک صاحب نظر بزرگ عالم اور معاشرہ ساز شاعر تھے جنہوں نے عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لئے عوام کی زبان کو اختیار کیا اور عوام کے مزاج کا ایک حصہ بن گئے ...... صاحب دل اور صاحب فکر نے خواجہ فرید کے کلام سے خوشہ چینی کی ہے سمجھا ہے اور

سمجھانے کی سعی کی ہے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ان بے شمار تحریروں کو یکجا کر کے علم کے متلاشی اور جویا لوگوں کے لئے آسانی فراہم کی ہے۔''

''پاکستان میں مطالعہ فرید کی روایت'': خورشید عالم کا ایم اے مطالعہ پاکستان کے لئے لکھا ہوا مقالہ ہے جسے اب کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

باب اول	خواجہ غلام فرید حیات، فن اور تہذیبی اثرات
باب دوم	اردو میں مطالعہ فرید کی روایت
باب سوم	سرائیکی میں مطالعہ فرید کی روایت
باب چہارم	پنجابی میں مطالعہ فرید کی روایت
باب پنجم	دیگر زبانوں میں مطالعہ فرید کی روایت
باب ششم	مجموعی تاثر
ضمیمہ	بھارت میں مطالعہ فرید کی روایت

اس کتاب میں آغاز سے لے کر ۱۹۸۹ء تک خواجہ فرید کے بارے میں اردو، انگریزی، سرائیکی اور پنجابی زبان میں لکھے ہوئے مضامین کی فہرست دی گئی ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسا اشاریہ ہے جو فریدیات کے صیغے میں کام کرنے والوں کی معاونت کرتا ہے۔ اسی طرح اُن کتب کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو خواجہ فرید سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے اہم کتب کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب فریدیات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خواجہ فرید کے بارے میں شائع شدہ تحریروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

''فکر فراق فریدی'': مہر گل محمد کی مرتبہ کتاب ہے جس میں خواجہ فرید کے بارے میں سرائیکی زبان میں لکھے گئے ۱۵ مقالات کا ایک کڑا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

۱۔	انوارِ فریدؒ	محمد اسلم میتلا
۲۔	خواجہ غلام فرید دا مشاہدہ فطرت	دلشاد کلانچوی
۳۔	فرید: جذبے تے فکر دا سچا شاعر	ارشد ملتانی

۴۔ خواجہ غلام فرید دے کلام وچ ریتاں — ڈاکٹر طاہر تونسوی

۵۔ خواجہ فرید دی شاعری تے ہیر رانجھا — عمر کمال خان

۶۔ خواجہ فرید: جدوجہد دا پیامبر — علامہ اعظم سعیدی

۷۔ خواجہ فرید دی شاعری — ڈاکٹر قاسم جلال

۸۔ خواجہ فرید دے کلام دا صوتی اعجاز — بتول رحمانی

۹۔ خواجہ غلام فرید دی شخصیت تے شاعری — اعجاز ڈیروی

۱۰۔ کلام فرید وچ لفظیں دی تکرار دا سوہنپ — م۔ ی۔ قیصرانی

۱۱۔ خواجہ فرید اپنی مثال آپ — ظہور احمد دھریجہ

۱۲۔ روہی جھوک فریدی — حمید الفت ملغانی

۱۳۔ خواجہ فرید تے ماء دھرتی — نذیر لغاری

۱۴۔ خواجہ فرید دے کلام وچ قرآن وحدیث — رحیم طلب

۱۵۔ جگ سو جھل بجھ فرید — فیاض علی شاہ

فہرست سے اس کی اہمیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ کتاب فریدیات کے محققوں کو رسائل کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دیتی ہے اور یوں پرانے رسائل کی فائلوں کی گرد جھاڑ کر اُس سے ستھرا مال نکالنے کی جو محنت اور ریاضت مہر گل محمد نے کی ہے اس پر داد نہ دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

''سلک سلوک فریدی'': حمید الفت ملغانی کی مرتبہ کتاب ہے، جس میں خواجہ فرید کے فکر وفن اور شخصیت کے بارے میں ۱۹ مضامین شامل ہیں جن کی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ خواجہ طاہر محمود کوریجہ — حضرت خواجہ غلام فرید تے اُنہاں دا خاندان

۲۔ ظہور احمد دھریجہ — حضرت خواجہ غلام فرید۔ حالات زندگی

۳۔ خواجہ معین الدین کوریجہ — خواجہ غلام فرید دے مختلف علم

۴۔ دلشاد کلانچوی — خواجہ غلام فرید دے کلام وچ تصوف

۵۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق — خواجہ فرید سئیں دے کلام وچ تیر متا نویں رُوپ

۶۔	ڈاکٹر طاہر تونسوی	خواجہ فرید دے کلام وچ عشقیہ داستاناں
۷۔	پروفیسر شوکت مغل	غلام فرید دیاں لسانی پرتاں
۸۔	محمد اسلم میتلا	خواجہ غلام فرید تے سرائیکی شعراء
۹۔	ظفر لاشاری	خواجہ فرید دا کلام امن تے محبت دا پیغام
۱۰۔	ڈاکٹر اشرف شاہین قیصرانی	دل دل دھڑکے پیر فرید
۱۱۔	ڈاکٹر نواز کاوش	حضرت خواجہ غلام فرید فن تے شخصیت
۱۲۔	ڈاکٹر اسلم عزیز درانی	خواجہ غلام فرید دی بہاریہ شاعری
۱۳۔	عمر علی خان بلوچ	خواجہ فرید دے کلام وچ صوفیانہ اصطلاحات
۱۴۔	مجید پیرزادہ	خواجہ فرید ولی کامل تے اُچے شاعر
۱۵۔	پروفیسر سجاد حیدر پرویز	حضرت خواجہ غلام فرید بطور نثر نگار
۱۶۔	میاں نذیر	فطرت: فرید دے کلام وچ
۱۷۔	پروفیسر فاروق فیصل	حضرت خواجہ فرید ہک عظیم صوفی شاعر
۱۸۔	عزیز فاطمہ	خواجہ فرید دا تصور عشق
۱۹۔	حمید اُلفت ملغانی	خواجہ فرید دے کلام وچ پندھ تے پندھیڑو

عکسِ فرید اور فکر فراق فریدی کی طرح یہ کتاب بھی خواجہ فرید کے بارے میں تحقیقی، تنقیدی، شخصی اور سوانحی مواد فراہم کرتی ہے اور محققینِ فرید کے لئے سہولت کا باعث بنتی ہے۔ اس انتخاب میں جس دیدہ ریزی اور تلاش و جستجو سے کام لیا گیا ہے وہ حمید الفت ملغانی کی محنت کا ثمرہ ہے جس کی تحسین ہر لحاظ سے جائز ہے۔

Selected Kafies of Khawaja Farid عامر حفیظ ملک کی مرتبہ کتاب ہے جس میں خواجہ فرید کی کافیوں کے منظوم تراجم کو بڑی کاوش و کوشش سے حاصل کر کے ایک لڑی میں پرو کر سامنے لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر شیکل، رؤوف لوتھر، اسلم انصاری اور جیلانی کامران کے تراجم سے تو سب واقف ہیں مگر اس کتاب میں ڈاکٹر شہزاد قیصر، ڈاکٹر عرش صدیقی، پروفیسر فروغ نوید، سلمان قریشی، بریگیڈیئر نذیر علی شاہ، عبدالرشید غوری اور

محمد سعید شیخ کے تراجم کو بھی شامل کیا گیا ہے جو پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں۔ تراجم کے ساتھ اصل کافیاں بھی دی گئی ہیں اور ان تراجم کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پیش لفظ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں روہی اور چولستان کی بارہ تصاویر اسے اور بھی دلکش بنا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد امین نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مجھے امید ہے کہ کتاب خواجہ فرید سے محبت کرنے والوں کے لئے کشش کا باعث ہوگی اور فریدیات میں نمایاں اضافہ ثابت ہوگی۔ اس حوالے سے پہلی بار اس طرح کا انتخاب شائع کیا گیا ہے یقینی طور پر اس کی بڑی پذیرائی ہوگی۔

''کون فرید فقیر'': دلشاد کلانچوی کے ۱۵ مضامین کا مجموعہ ہے۔ فہرست دیکھیے۔

۱۔ خواجہ غلام فرید تے آپ دی شاعری
۲۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ تصوف
۳۔ حقیقت حسن تے خواجہ علیہ رحمت
۴۔ عشق رسولؐ تے خواجہ علیہ رحمت
۵۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ اخلاقیات
۶۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ جذبات نگاری
۷۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ واقعہ نگاری
۸۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ ثقافتی علامتاں
۹۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ سسی دا کردار
۱۰۔ خواجہ علیہ رحمت دے کلام وچ غزل دا رنگ
۱۱۔ خواجہ علیہ رحمت تے لوکاں دی فلاح و بہبود
۱۲۔ خواجہ علیہ رحمت تے ''صبح صادق''
۱۳۔ جیندیں عرب شریف ڈٹھوسے
۱۴۔ مدتاں پچھے رانجھن ملیا
۱۵۔ غوث، قطب سب تیں توں صدقے

۱۶۔ خواجہ غلام فرید دی حیاتی دیاں تاریخ وار گالھیں

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی اب دوبارہ ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ یہ مقالے اگرچہ بہت مختصر ہیں تاہم ان میں دلشاد کلانچوی نے اجمال میں تفصیل بیان کر دی ہے۔ یوں اس کتاب میں خواجہ فرید کے بہت سارے گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ سادہ اور سہل زبان کی وجہ سے یہ عام لوگوں کی دلچسپی کا باعث بھی بنی ہے۔

تناظراتِ فرید کو عائیزہ قریشی نے مرتب کیا ہے اس کا نام بھی چونکا دینے والا ہے اور اس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ایسے مضامین و مقالات کا انتخاب کیا جائے جو خواجہ فرید کے نظریۂ فکر و فن سے تعلق رکھتے ہوں۔ مضامین کی فہرست سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے جو یہ ہے۔

خواجہ فرید بطور نثر نگار	سجاد حیدر پرویز
خواجہ فرید سچے جذبوں کا شاعر	ڈاکٹر شاہد رضوی
خواجہ فرید کے ہمعصر سرائیکی شعراء	نذیر لغاری
کلامِ فرید میں مسافت کا حوالہ	حمید اُلفت ملغانی
خواجہ فرید اور نظریۂ جمالیات	عمرانہ پروین عنبر
خواجہ فرید کی اُردو شاعری	عائذہ قریشی

کتاب کی مُرتب عائذہ قریشی نے جس محنت ریاضت اور کاوش سے اخبارات و رسائل کو کھنگال کر یہ مضامین حاصل کیے ہیں اس کی داد نہ دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔ اُنہوں نے خواجہ فرید سے عقیدت کی بنا پر یہ کتاب مرتب کی ہے اور اس کا فائدہ فریدیات پر کام کرنے والوں کو ہوگا اور یوں یہ کتاب ایک حوالے کا کام بھی دے گی کہ اس میں ایسے مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں جو اپنے موضوع کی اہمیت کی بنا پر خواجہ فرید کے نظریات، اس کی شاعری اور اس کے فکر وفن کا مکمل احاطہ کرتے ہیں اور خواجہ فرید کی تفہیم کی راہ کو آسان بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

''کلام فرید اور مغرب کے تنقیدی حوالے'' خورشید ناظر کی تصنیف ہے۔ اس کا نام چونکا دینے والا ضرور ہے تاہم یہ بات حیران کن ہے کہ جن مغربی ناقدین اور خواجہ فرید کا کسی نہ کسی حوالے سے تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے وہ ان کے پیش رو ہیں اور ان کے اثرات یقینی طور پر خواجہ فرید کی شاعری اور کلام پر ہوئے ہوں گے۔ اور اگر یہ بات پہلے تسلیم کر لی جائے کہ خواجہ فرید نے ان مغربی شاعروں اور نقادوں کا مطالعہ کیا ہوگا (اور یہ بات تحقیق طلب ہے)۔ اس سلسلے میں اُردو اکیڈمی کے صدر اور معروف افسانہ نگار طارق محمود نے یہ وضاحت اپنے حرفِ چند میں کر دی ہے کہ:

> ''اس تخلیق پارے میں ایک نئے انداز سے کلام فرید کا مغربی ناقدین مثلاً ہومر، افلاطون، ارسطو، لانجائنس، دانتے، فلپ سڈنی، ورڈز ورتھ اور کولرج کے تنقیدی خیالات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا

ہے۔''

یوں دیکھا جائے تو مغرب کے تنقیدی معیارات کے حوالے سے خواجہ فرید کو پرکھا اور جانچا گیا ہے۔ اگر خواجہ فرید کی شاعری کا تقابلی مطالعہ مغربی شعراء ورڈز ورتھ، شیلے اور کیٹس سے کر دیا جاتا تو اس کی صورت اور بھی نکھر جاتی۔ تاہم مغربی تنقیدی نظریات کا خواجہ فرید پر اطلاق ایک عمدہ کوشش ہے جو بحث کے نئے در وا کرتی ہے۔

ان کے علاوہ درج ذیل کتب بھی شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔

اسرارِ فرید (حصہ اول)	حضرت مخدوم احمد میاں قریشی الکوریجہ	الکوریجہ پبلی کیشنز، چاچڑاں شریف۔ ۲۰۰۰ء
Khawja Ghulam Farid (Poetry: A Brief Analysis)	محمد سعید احمد شیخ	سرائیکی ادبی مجلس، بہاولپور۔ ۲۰۰۰ء
اُستاد ولیند ے	محمد سعید احمد شیخ	جھوک پبلشرز، ملتان۔ ۲۰۰۰ء
خواجہ غلام فرید شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر روبینہ ترین	سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان۔ ۲۰۰۰ء
کلام حضرت خواجہ غلام فرید	مرتبہ پروفیسر حمید اللہ ہاشمی	مکتبہ دانیال، لاہور شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، اُردو بازار، لاہور۔

اسرارِ فرید (حصہ اول) میں حضرت مخدوم احمد میاں قریشی الکوریجہ نے مستند حوالوں سے خواجہ فرید کی زندگی، تصوف سے ان کی دلچسپی، ان کی زندگی کے معاملات و معمولات اور ان کے شب و روز اور تعلقات کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ آخر میں خواجہ فرید کے مکتوبات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود دلچسپی سے

خالی نہیں۔ اس لیے کہ اس میں بہت سی نئی باتیں پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اُمید ہے کہ اس کا حصہ دوم مکمل اور بھر پور ہوگا۔

Khawaja Ghulam Farid (Poetry: A brief analysis)

میں محمد سعید احمد شیخ نے خواجہ فرید کی زندگی، ان کے نظریات، ان کا فکر وفن، ان کا تصوف، ان کی شاعری میں تصورِ محبت، علامت نگاری، نظریۂ حسن وعشق، شاعر فطرت کے تناظر میں ان کی کافیوں کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے اُردو کلام کا جائزہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب خواجہ فرید کے افکار ونظریات کی ایک عمدہ اور قابل قدر تجزیاتی دستاویز ہے جس میں مصنف کا اپنا نقطۂ نظر واضح ہے اور اس نے خواجہ فرید کو جس طرح سمجھا ہے اس کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب خاصی اہمیت کی حامل ہے اور خواجہ فرید کے فکر وفن کی تشہیر اور تفہیم کا ایک بڑا وسیلہ بنتی ہے۔

''اُستاد دلیندے'' بھی سعید احمد شیخ کی تصنیف ہے جس میں خواجہ فرید کے کلام پر حسین بن منصور حلاج اور محی الدین ابن العربی کے فلسفے کے اثرات کا فکری جائزہ لیا گیا ہے اور وحدت الوجود کے فلسفے کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کی فہرست سے اس کی اہمیت اور افادیت اور مباحث کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

(الف) تصوف دے خواجہ فرید تک دے پندھ دا جائزہ

(ب) تعارفی جائزہ

(ج) فلسفہ وحدت الوجود

(د) اناالحق وابھیت

(ف) معرفتِ نفس

(ق) انسان دا مقام

(ک) وحدتِ ادیان

(م) کجھ ضروری اصطلاحواں دی تشریح

...... جہاں مصنف کے گہرے مطالعے کی نشاندہی کرتی ہے وہاں تصوف، اس کے مدارج

خاص طور پر نظریۂ وحدت الوجود سے ان کی دلچسپی کا مظہر بھی ہے۔ بقول فلیپ نگار ظہور احمد دھریجہ:

''سرائیکی زبان میں لکھی گئی یہ کتاب جو اپنی نظیر آپ ہے فریدیات میں ایک انمول اضافہ ثابت ہوگی۔''

حقیقت بھی یہی ہے کہ تصوف اور اس کے متعلقات پر جو سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور جس طرح خواجہ فرید کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس کی بنا پر یہ کتاب بڑی اہم ہے۔

''خواجہ غلام فرید شخصیت اور شاعری'' ڈاکٹر روبینہ ترین کی تصنیف ہے جس میں خواجہ فرید کی اُردو شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور محاسن و مصائب دونوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یقینی طور پر خواجہ فرید کا سرائیکی کلام اُردو کلام کے معاملے میں بہت بلند ہے اس لیے شک گزرتا ہے کہ کیا یہ خواجہ فرید ہی کا کلام ہے۔ اس حوالے سے مباحث کے نئے در کھل جانے کے بے پناہ امکانات ہیں۔

کلام حضرت خواجہ غلام فرید کو پروفیسر حمید اللہ ہاشمی نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں متن اُردو ترجمہ اور مشکل الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں۔ اس طرح تفہیمِ فرید کو آسان کرنے کے لیے یہ ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔ اس میں تعارف، کلامِ فرید، خواجہ غلام فرید کی حیات و تعلیمات اور خواجہ غلام فرید کی صوفیانہ شاعری کے عنوانات میں خواجہ فرید کا مکمل عکس پیش کیا گیا ہے۔ کافیوں کے اشعار کا مختصر ترجمہ خواجہ فرید کے کلام کے معنی سمجھانے میں معاون ..ت..وتا ہے۔ حمید اللہ ہاشمی نے یہ کام بڑی محنت اور لگن اور جانکاہی سے سرانجام دیا ہے۔

بھا..ت (۱) میں بھی خواجہ فرید پر تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر کالا سنگھ بیدی ..نے ..ٰیں خواجہ فرید کے نام سے دیوانِ فرید مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر اجیت سنگھ ناہر کی ..ساب ''..خو..اجہ فرید۔ صوفی مت دے آخری شاعر'' اور رام پرشاد تونسوی کی کتاب ''یار فریدؔ'' شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر پرشاد لوچن نے ''خواجہ فرید دی شاعری سجاتے ریت''،

---

(۱) اس سلسلے میں تفصیلی معلومات حنیف چوہدری کے مضمون ''بھارت میں خواجہ فرید کی مقبولیت'' مشمولہ تناظرات فرید مرتبہ عائذہ قریشی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر گوربچن سنگھ متوانے ''فرید دی شاعری اتے سندھی اثرات'' اور جگجیت موہن جتوئی نے فرید دا مقام پر پی۔ایچ۔ڈی کے لیے مقالے تحریر کیے ہیں۔

خواجہ فرید کے فکر و فن پر لکھے گئے مضامین کو سنہ وار اشاریۂ فرید میں ترتیب دے دیا گیا ہے۔ جو محققین کے لیے اور فریدیات کے موضوع پر کام کرنے والوں کی راہ آسان بنا دے گا۔ یہ اشاریہ میری کتاب ''مطالعۂ فرید کے دس سال'' بک مین الشجر بلڈنگ نیلا گنبد لاہور ۲۰۰۱ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں ان دس برسوں میں فریدیات پر جو کام ہوا ہے وہ ہر اعتبار سے لائقِ تحسین ہے۔

پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویئے (سرائیکی شاعری)

بے شک میرے ہاتھ میرے پیچھے باندھ دو
مجھ سے میری کتابیں اور سگریٹ چھین لو
میرے منہ میں مٹی بھی بھر سکتے ہو
مگر شعر میرے دل کا دھڑکتا ہوا خون ہے
میری روٹی کا نمک ہے
میری آنکھوں کا پانی ہے
یہ ناخنوں سے پلکوں سے اور خنجروں سے لکھا جائے گا
میں جیل کی کوٹھڑی میں بھی گاتا رہوں گا
غسل خانے میں بھی
اور اصطبل میں بھی گنگناتا رہوں گا
کوڑوں کے نیچے بھی شعر کہتے رہیں گے
ہتھکڑیوں کے درمیان
زنجیروں کی جھنکار بھی گاتی رہے گی
میرے اندر لاکھوں بلبل ہیں
جو مجھے جنگی ترانے سناتی رہتی ہیں

(محمود درویش)

"ملتان میری یا میرے باپ کی ملکیت نہیں یہ اسلامی حکومت ہے اور میں اس کا نگہبان اور پاسبان ہوں' پاسبان کا کام حفاظت مال میں جان دے دینا ہے۔ ملتان کسی کو نہیں مل سکتا' ملتان کی چابیاں مظفر خان کے پیٹ میں ہیں' جو اسے پھاڑے گا وہ ملتان کا مالک بنے گا۔"

(نواب مظفر خان شہید)

ساڈیاں اکھیں رت مینہ ترمدیاں

ساڈے من ماندے ڈینہہ رات

ساڈے منہ تے جندرے جبر دے

ساڈے ہتھ کڑیاں وچ بند

اساں قیدی تخت لہور دے

اساں قیدی تخت لہور دے

(عاشق بزدار)

"ہماری آنکھیں لہو کی بارش ٹپکا رہی ہیں' ہمارے من رات دن اداس ہیں' ہمارے منہ پر جبر کے تالے لگے ہیں اور ہمارے ہاتھ ہتھکڑیوں میں بند ہیں' ہم تخت لاہور کے قیدی ہیں' ہم تخت لاہور کے قیدی ہیں۔"

محمود درویش' نواب مظفر خاں شہید اور عاشق بزدار کے یہ اظہارات اپنے جغرافیہ' اپنی تاریخی اور اپنے معاشرتی ماحول کے تناظر میں مزاحمتی اور احتجاجی رویوں کا ایک واضح منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور جبر کی اس صورت حال کی نشاندہی کرتے ہیں' جس سے خود انھیں' ان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے لوگوں' تاریخی جبر میں سانس لینے والے انسانوں' استحصالی قوتوں کے خلاف لڑنے والے جیالوں کو سامنا کرنا پڑا ہے' پڑ رہا ہے اور پڑتا رہے گا۔

رضی عابدی نے اپنی کتاب "تیسری دنیا کا ادب" میں ان رویوں اور ان کے پس منظر میں کارفرما مزاج کا تذکرہ کیا ہے اور ان عوامل و علل کا کھوج لگایا ہے جو مزاحمتی اور مدافعتی ادب کا موجب بنے ہیں۔ ان کے بقول:

"اس دنیا کے ادب میں دو رجحانات بہت واضح ہیں' ایک طرف فرد اور معاشرے کے درمیان مکمل ہم آہنگی پر زور ہے تو دوسری طرف فرد اور کائنات کے درمیان ایک مستقل کھچاؤ اس کا موضوع ہیں' ایک طرف مشکلات کے سامنے اعتماد' ظلم کے مقابلے میں پامردی اور انسانی ہمدردی کے جذبات ملتے ہیں تو دوسری طرف ایک روحانی بے چینی' ایک جذباتی خلش' ایک مابعد الطبیعاتی کھوج اور ان کی تڑپ نظر آتی ہے۔ یہ ادب ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جہاں بنیادی مسائل اور

طبقاتی ناہمواریاں آدمی کو تنگ نہیں کرتیں بلکہ جہاں شاعر کے لئے خود اس کا وجود ایک بڑا سوال بن جاتا ہے۔ ایک ایسا معمہ نظر آتا ہے جس میں کرب بھی ہے اور جستجو بھی!"

اس اقتباس کے حوالے سے ہم ادب کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے اپنا حق مکمل طور پر ادا کیا ہے چنانچہ تیسری دنیا کے ممالک ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، چین، لاطینی امریکہ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ، گھانا، نائجیریا، فلسطین اور پاک و ہند کی شاعری وہاں کے دانشوروں کے خیالات و افکار کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے۔

جہاں تک پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادب کا تعلق ہے اور پھر خاص طور پر اردو ادب کا----- تو اس سلسلے میں گزشتہ تیرہ برسوں کے تخلیقی اظہار کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ جس کے بارے میں رضی عابدی کی رائے ہے کہ "اردو ادب کا منظر نامہ نئے شعور سے خالی ہے، غم و غصہ کے گاہے بگاہے اظہار کے باوجود نہ دشمن کی پہچان ہے نہ منزل کا تعین، اس خطہ کے ادیب و شاعر کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہیں اور عجیب سی جھنجلاہٹ کے شکار ہیں۔ ان کی تحریروں میں بیزاری ہے، مایوسی ہے، بے بسی ہے۔"

مگر ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے اس سے مختلف ہے ان کے بقول "یہ شاعری اعصابی تناؤ کی پیداوار ہے، یہ شاعری بے یقینی کی پیداوار ہے، یہ شاعری ماس ہسٹریا کی پیداوار ہے لیکن---- اور یہ لیکن بہت بڑی ہے کہ یہ شاعری روح عصر کا آئینہ ہے تاریخ کے جبر کا استعارہ ہے۔"

امین مغل نے "پاکستانی ادب کے نئے رجحانات" میں اس حدیث نبویؐ کے حوالے سے کہ جبر کے ماحول میں پرندے تک اپنے گھونسلوں سے ہجرت کر جاتے ہیں" بات کرتے ہوئے لکھا ہے "پرندے اپنے گھونسلوں میں مر رہے ہیں، نہ صرف پرندے مر جاتے ہیں بلکہ نثر گھبرا کر شاعری میں پناہ لیتی ہے اور نثر شاعری میں پناہ لے رہی ہے۔"

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مضمون "پاکستانی ادب میں احتجاج کی آواز" لکھا ہے:

"جب کوئی قوم غلامی یا ظلم و استحصال کی جارحانہ قوتوں کے خلاف جد و جہد کرتی ہے تو اس کے ادب میں بھی اس صورت حال کا انعکاس فطری ہوتا ہے' اس لئے کہ ادب کی تخلیق کے سرچشمے قومی زندگی کی واردات اور اجتماعی حوادث و حالات سے پھوٹتے اور ادب کی شخصیت کے حوالے سے ایک ارتقائی لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ پاکستانی ادب میں بھی پاکستانی عوام کی سیاسی اور تہذیبی جدوجہد کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔"

ان سارے ادبی حوالوں کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ پاکستانی ادب میں مزاحمتی اور مدافعتی عوامل کس طریقے سے نموپذیر اور تخلیق پذیر ہوئے ہیں اور پھر یہ کہ اس ساری کیفیت سے سرائیکی وسیب کی صورت حال مختلف بھی ہے اور الگ تھلگ بھی' اس خطے کو جسے جنوبی پنجاب کہا جا رہا ہے ہر دور میں عجیب و غریب حالات سے گزرنا پڑا ہے اور یہاں کے بسنے والوں نے جس تاریخی جبر کا سامنا کیا ہے وہ وقت کے ماتھے پر نقش ہے اور اس کا اظہار بھی کھل کر ہوا ہے خاص طور پر شاعری میں ---- اور میں لمحہ موجود میں صرف سرائیکی شاعری کے حوالے ہی سے جائزہ لوں گا اس لئے کہ سرائیکی نثر نے بھی سرائیکی شاعری میں پناہ لے لی ہے' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاعری کے ذریعے اور وسیلے سے نہایت ہی کھلے ڈلے انداز بلکہ موثر ترین انداز میں وہ سب کچھ کہا جا سکتا ہے جو نثر میں ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ میری یہ رائے اگرچہ حتمی نہیں تاہم میرا خیال اور تجربہ یہی ہے اور ویسے بھی مزاحمتی حوالے سے سرائیکی شاعری میں بڑے بھرپور طریقے سے وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو شاعر کہنا چاہتا ہے گویا لبوں کی بات کاغذ پر لفظوں کے حوالے سے ابھر آئی ہے اور اس شاعری میں خاصی ورائٹی' تنوع' بلند بانگ لب و لہجہ اور شدت ہے۔

اس پس منظر میں سرائیکی میں مدافعتی اور مزاحمتی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو کئی طرح کے رجحانات اور رویے سامنے آتے ہیں جنہیں کئی ذیل سرخیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور پھر ان کے بھی کئی پہلو ہیں:

۱۔ لسانی پہلو کہ سرائیکی ایک الگ زبان۔

۲- معاشی پہلو کہ جنوبی پنجاب کے تمام تر وسائل اس کی تعمیر و ترقی پر خرچ کئے جائیں۔

۳- دھندی سٹیٹ اور چولستان کی زمینوں کی مقامی آبادی کو الاٹمنٹ

۴- جنوبی پنجاب میں آباد کاروں کا مسئلہ

۵- بیوروکریٹس کا استحصالی رویہ

۶- پاکستان کے وسیع تر تناظر میں جبروتشدد کے خلاف احتجاجی رویہ

۷- سرائیکی صوبے کا قیام

اس کے علاوہ بھی کچھ اور پہلو ہو سکتے ہیں' یہ اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ سرائیکی شاعری میں موجود ہے جس میں ان ظالم طبقوں کے خلاف قلم و قرطاس کے حوالے سے آواز اٹھائی گئی جو ظالم قوتوں کا آلہ کار بنتے ہیں۔ مجاہد جتوئی نے اپنی کتاب "جیسا میں نے سوچا" میں بڑی تفصیل اور اپنے انداز میں ایسے تمام پہلوؤں اور رویوں پر اظہار خیال کیا ہے اس دعوے کے ساتھ کہ "ایک مصنف کا محتسب کون ہو سکتا ہے' احتساب کا معیار کیا ہے' "سچ" سب سے بڑا سچا کون ہے۔ اگر سچ ہر ایک کی نظر میں مختلف ہے تو سچا بھی مختلف ہو سکتا ہے' میرا سب سے سچا وہ ہے جس نے بتایا' مذہب ظالم کی نہیں مظلوم کی حمایت کرتا ہے۔"

بہرحال سرائیکی شاعری میں مزاحمتی شاعری اور مدافعتی رویوں کا سراغ لگایا جائے تو سب سے پہلے لوک ادب میں "وار" اس کا سب سے بڑا حوالہ ہے' نواب مظفر خان شہید ملتان کے وہ ہیرو ہیں جنہوں نے سکھوں کے خلاف زبردست مزاحمت کی' اس کی ہمت' حوصلے اور پامردی کو مختلف شاعروں نے "وار" کے حوالے سے موضوع بنایا ہے اس سلسلے میں اب تک تین کتابیں عمر کمال خان کی "ملتانی واراں" پروفیسر شوکت مغل کی "ملتان دیاں واراں" اور م ی قیصرانی کی سرائیکی "تاریخی واراں" چھپ کر آچکی ہیں۔ ان میں دلپت رائے لاہوری' میاں رحموں نظام' شاہ عظیم اور سوبھا شجاع آبادی کی واریں مزاحمتی ادب کے سلسلے کی کڑی ہیں' آغاز میں میں نے نواب مظفر خان کے تاریخی فقرے درج کئے ہیں جن سے نواب کے رویوں کا پتہ چل جاتا ہے' مثنوی "عاقبت بخیر" میں سید ساجد علی فنائی نے اسی جانب اشارہ کیا

ہے وہ کہتے ہیں:

تو دھمکی سے اے راجہ سکھاں کا
لیا چاہتا ہے قلعہ ملتان کا
نہ جب تک کہ مردوں کی دھاڑیں پڑیں
نہ جب تک کہ توپوں کی ماریں پڑیں
نہ جب تک کہ فوجوں کی ہو دھوم دھام
نہ جب تک کہ منہ خوں سے ہو سرخ فام
قلعہ کا تو ملنا' یہ ممکن نہیں
اڑے تو اگرچہ بہ عرش بریں

چنانچہ سقوط ملتان اور مظفر خان کی شکست کو بہت سے شاعروں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا' نواب سرفراز خان' منشی غلام حسین شہید' لالہ سوہن لال' گنیش داس پنگل' دلپت رائے لاہوری' نظام' شاہ عظیم' سوبھا شجاع آبادی اور سید ساجد علی فنائی نظام کے بقول:

جو کوئی مندا منگے مندا ملتان دا جی
سر دور ہووے دھڑ دکھ میاں

"جو کوئی بھی ملتان کا برا چاہے اس کا سر الگ ہو اور دھڑ الگ ہو جائے۔"

شاہ عظیم کی "وار" کا ایک ٹکڑا دیکھئے:

بانہاں بنھ کے پتراں عرض کی اگے حضرت قبلہ گاہ دے
تکواراں مریسائیں اسیاں جیویں خان دوران بھڑا نادر شاہ دے
قلندر امام جو لڑیا نال یزید دے دھماں پیناں وچ سپاہ دے
خان خاناں ماری برچھی ہاتھی سیتویں وچ فنا دے
امام حنفی کوں کشا یزید نے رکھ رت دی وچ واہ دے
مرن کولوں اساں نئیں ڈرنا لکھیا ملی وچ درگاہ دے
ہکے تخت' تے ہکے تختہ مرن جیون وس خدا دے

"بیٹوں نے حضرت قبلہ گاہ کے آگے ہاتھ باندھ کر عرض کی ہم بھی ایسی

تلواریں ماریں گے جس طرح خان دوراں نادر شاہ سے لڑا تھا' قلندر امام جس طرح یزید کے ساتھ لڑا اور فوجوں میں دھوم مچا دی' خان خاناں نے برچھی مار کر ہاتھی کو فنا کر دیا' جس طرح یزید نے امام حنفی کو قتل کیا اور لہو کی نہر بہا دی' ہم مرنے سے نہیں ڈرتے اس لئے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا ہوا ہے مل کر رہے گا' تخت یا تختہ ہمارا مقصد ہے اس لئے کہ جینا مرنا خدا کے اختیار میں ہے۔"

نظام کی "وار" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

غ غیرت ملک دی دور کرو میراں! مہر کرو ملتان اتے
رن کا رلعین کوں مار گھتو جیہڑا چک یاوے ملتان اتے
لاہور کوں چکنا چور کرو میراں! مہر کرو ملتان اتے
نظام امبر اسردے وچ جو بانگاں آکھے لسندے کو ہی جو اسمان اتے

"یہ تو غیرت کا سوال ہے میراں! ملتان پر رحم کھاؤ' ان جنگ جوؤں کو مار ڈالو جو ملتان کو کاٹتے ہیں' اے میراں! لاہور کو تباہ کر دو اور ملتان پر رحم کھاؤ۔ نظام آسمان کے نیچے جو اللہ تعالیٰ کو آواز دیتا ہے وہ اپنے دشمن پر بھی غصہ کھاتا ہے۔"

واروں کے بارے میں دانشور اور صحافی سئیں مظہر عارف نے لکھا ہے:

"واراں سماجی اور سیاسی حالات کا آئینہ دار ہوتی ہیں' جہاں بھی قومی حقوق کی تحریکیں چلی ہیں وہاں کے قوم پرستوں نے تاریخی ورثے کی تلاش و تحقیق کی ہے اور تعمیر تاریخ کے اس کام میں واراں اہم ترین ذریعہ بنی ہیں' غلام بندے کے چہرے پر ملے ہوئے مختلف قسم کے رنگوں کو کھرچ کر اس کی اصلی شکل نکالنا بہت بڑا کام ہے۔"

چنانچہ یہ سب واریں مخالف قوتوں کے خلاف مزاحمت کی سب سے بڑی دستاویز ہیں۔

سکھوں کے بعد انگریزوں کے خلاف بھی سرائیکی وسیب کے لوگوں نے مزاحمتی تحریکیں چلائیں اور شاعروں نے ان کے استحصالی رویوں اور حکمران ٹولے کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی' سرائیکی زبان کے عظیم شاعر حضرت خواجہ فرید کو بھی کہنا پڑا:

اپنی صاحبی آپ وساں توں
پٹ انگریزی تھانے

"اے نواب آف بہاول پور! اپنی مملکت کو آپ ہی آباد رکھ اور انگریزی عملداری کو جڑ سے اکھیڑ دے۔"

اسی طرح تحریک پاکستان میں انگریزوں کے خلاف جس ردعمل کا اظہار کیا اس کی کچھ جھلکیاں میری کتاب "سرائیکی ادب: ریت تے روایت" میں شامل مضمون "تحریک پاکستان میں ضلع ڈیرہ غازی خان کا حصہ" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک جو منظر نامہ اور جو واقعات و حوادث گزرے ہیں ان سے بھی سرائیکی شاعر غافل نہیں رہے بلکہ ان تمام پہلوؤں کو جن کا تذکرہ میں نے اوپر کیا ہے کسی نہ کسی وسیلے سے اپنی شاعری کا موضوع بناتے رہے اور اس طرح عصری شعور و آگہی کا عملی ثبوت فراہم کرتے رہے۔ سرائیکی وسیب کو جس طرح کی ناانصافی اور عدم تعاون کا سامنا ہے اس کا اظہار سرائیکی شعراء کے ہاں مختلف حوالوں سے علامتی اور استعاراتی شکل میں یا صاف اور دو ٹوک الفاظ میں ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے' ارشد ملتانی نے ظلم کی شب کے ڈھلنے کی تمنا کو اپنی نظم "سفر دی ھک رات" میں موضوع بنایا ہے:

جن تے نظراں بھال تے ڈیہدھاں
چپ دی چادر منہ تے گھت کے
ایڈے اوڈے سبھے مسافر
نندر دے مست گھمارے ڈے کے
لمبے لمبے ساہ پئے گھندن
اے آوازاں اینویں آندن
جیویں میڈے چار چھیروں
رات دے بشیر ناگ پے شوکن
کالیاں کالیاں ڈائنیں گھوکر
میڈیا مولا میڈیا ربا
کیڑھے ویلے رات ے مکسی
گاڈی اے منزا تے پجسی

"جدھر بھی نظریں پھیر کر دیکھتا ہوں چپ کی چادر منہ پر ڈال کر ادھر ادھر سب مسافر نیند میں مست خراٹے لے رہے ہیں اور لمبے لمبے سانس لے رہے ہیں' مجھے اس طرح کی آوازیں آتی ہیں جیسے میرے چاروں طرف سیاہ کالے سانپ پھنکار رہے ہوں یا کالی کالی ڈائنیں آوازیں لگا رہی ہوں۔ اے میرے مولا' اے میرے رب! یہ رات کب ختم ہو گی اور گاڑی کب منزل پر پہنچے گی۔"

قیس فریدی کی نظموں اور غزلوں میں سرائیکی وسیب کی ڈر اور خوف کی پوری فضا تاریخی ورثے کے حوالے سے محفوظ نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ظلم تیڈے دی نگر دا ڈینہہ تھی گئے لاٹ ملاناں کیوں
کہیں کوچے وچ لاش نئی ڈسدی سنجھاں تھی گن واناں کیوں

"تیرے ظلم کی نگری کا دن کیوں ڈوبنے لگا ہے اب کسی کوچے میں کوئی لاش نظر نہیں آتی' اب جگہیں کیوں ویران ہو گئی ہیں۔"

کوئی ڈاکو نئی رہ گیا جیکر
لانوین لسندی دا ڈاج کیڈے گیا
ساری دھرتی دے کھیت جیں راوھن
اوندے گھر دا اناج کیڈے گیا

"اگر کوئی ڈاکو نہیں رہ گیا تو پھر دلہن کا جہیز کہاں گیا ہے؟ تمام دھرتی میں جس نے کھیت کاشت کئے ہیں اس کے گھر کا اناج کہاں گیا ہے؟"

میں قیس فقط امن دی خاطر ودا شرداں
ہیں سانگے ہے جا جا تے بکی جنگ اجن تئیں

"قیس میں فقط امن کی خاطر لڑ رہا ہوں اس لئے جگہ جگہ اب بھی جنگ جاری ہے۔"

اسی طرح اپنی نظم "اگاترا وچن" میں وہ بڑے عزم سے کہتے ہیں:

نگر اے میڈی عظیم دھرتی
ایہہ مینہ لمیں دا جو وسدا پیا ہے

جو ڈھک نظر داپے راکٹیں دا
برود دے جو پہاڑ ڈسدن
خدائے جیں ڈینہ ولایا وارا (ضرور ھک ڈینہ ولیے وارا)
تاں اے سمو اسلحہ تیڈے غاصبیں دے سینے تے
وانگ منگیں دے ڈل ڈکھیوں
وچن نبھیسوں

"مگر اے میری عظیم دھرتی جہاں جنوب کی بارش برس رہی ہے اور راکٹوں کا جو ڈھیر نظر آرہا ہے اور بارود کے جو پہاڑ دکھائی دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب موقع دیا (ایک دن ضرور ایسا آئے گا) تو پھر یہ اسلحہ تمہارے غاصبوں کے سینے پر رکھ کر اس کی چھاتی پر مونگ دلنے کا منظر دکھائیں گے اور اپنا وعدہ نبھائیں گے۔"

گویا شاعر اپنے وطن اور دھرتی پر غیروں کے قدم بھی نہیں دیکھنا چاہتا اور اس وقت کے انتظار میں ظلم و تشدد کی چکی اور راکٹوں اور بارود کی بارش میں دکھ سہ رہا ہے۔ جب اسے بھی موقع ملے گا اور وہ ان سے اپنا بدلہ چکائے گا۔

حسن رضا گردیزی ایک اور حوالے سے انسان کی سائنسی ترقّی کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں وہ اپنی نظم "العلم حجاب الاکبر" میں کہتے ہیں:

ایہہ تیڈا علم ڈیندا ہے کہ حیوان ہیں توں
ایہہ تیڈا علم ہے چشماں دی حیا دا دشمن
ایہہ تیڈا علم زمیناں دے کلیجے پاڑے
ناگاساکی تے ہیروشیما دے وہ جھگے ساڑے
ایہہ تیڈے علم کوں فطرت دے اشارے کیئے نی
ایہہ تیڈے علم دی پلکاں تے ستارے کئے نی

"یہ تمہارا علم بتا رہا ہے کہ تم حیوان ہو' یہ تمہارا علم آنکھوں کی حیا کا دشمن ہے' اس تمہارے علم نے زمینوں کے کلیجے پھاڑ دیئے ہیں۔ ناگا ساکی اور ہیرو شیما کے گھر جلا کر راکھ کر دیئے ہیں' اس تمہارے علم کو فطرت کے اشارے نہیں ملے اور اس تمہارے علم کی پلکوں پر ستارے نہیں ہیں۔"

اسی طرح ایک بندی خانہ' نوکر دا بچہ' اج دی رات اور فرار ان کے مختلف رویوں اور سوچوں کی عکاس ہیں۔

اقبال سوکڑی ایک عوامی شاعر ہے اور اس نے عام لوگوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑے بھرپور طریقے سے کی ہے' اس کی شاعری میں درد' محرومی اور بغاوت کے رویے نظر آتے ہیں۔ اس کی نظمیں غریب' مزدور' ظلم دی چکی پنڑی' سوال' اجاں وی آہدو ضرور بولاں' چند ڈھا وساخ دا' کال' کریہہ دے جائے ان کی غمازی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں غزل میں اس کا یہ احتجاجی رویہ بھی موجود ہے' اس کے تخلیقی اظہار کے کچھ نمونے دیکھئے:

بھٹو . والے بوچھن سیواں
سارا ڈینہہ سوئی ماراں
اپنے بال وساراں
تن تے میل کچیلے کپڑے
والیں تے ے لیکھاں
سراچ چبھن سیکھاں
اس سارے پورھے دا مل اے پنج روپے روک
بھکے میڈے دیس دے لوک

"بھٹو والے دوپٹے سیتی ہوں' سارا دن سوئی سے کام کرتی ہوں اور اپنے بچوں کو بھی بھول جاتی ہوں۔ میرے تن پر میلے کچیلے کپڑے ہیں اور بالوں میں سو سو جوئیں پڑ گئیں ہیں اور سر میں سیخیں چبھتی ہیں اور اس ساری محنت کا صلہ صرف پانچ روپے' نقد' میرے دیس کے لوگ بھوکے ہیں۔"

ایک اور اظہار!

کیویں بہاریں دی آس رکھاں ہزار باغ اتھ اجڑ دے ڈیہداں
ہنجوں دی کوئے نی کیویں بجھلواں میں گھر غریباں دے سڑ دے ڈیہداں
شریف لوکیں دے نال اکثر میں سر پھرے لوک لڑدے ڈیہداں
میکوں اجازت نہیں الاون دی کیویں میں اتھ زبان کھولاں

اجاں وی آہدو د ضرور بولاں

(اجاں وی آھدو ضرور بولاں)

"میں بہاروں کی امید کیسے رکھوں اس لئے کہ میں ہزار ہا باغ اجڑتے دیکھتا ہوں' میرے پاس آنسو بھی نہیں کہ غریبوں کے گھروں میں لگی آگ کو بجھا سکوں۔ شریف لوگوں کے ساتھ اکثر غیر شریفوں کو لڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ مجھے تو بولنے کی اجازت نہیں' میں اپنی زبان کس طرح کھولوں' اس کے باوجود بھی آپ کہتے ہیں کہ میں ضرور بولوں۔"

کریسہ ہے کالی کریسہ یارو
نہ موسمیں دا مزاج ایجھاں
جو کہیں سیانے دی سوچ دا مسترد صحیفہ
ولا پڑھے کون
پہاڑ دے گرم خشک پلو دے وچ اے وستیاں
جیویں کہیں بال دے پرانے تے میلے چولے دے پاڑے چیرے ہوئے پلو وچ پروتھی ہوئی مٹی دیاں گونگیاں ٹھوٹھیاں
میڈے محلے تے میڈے وسے دے بال بھل گین
او گیت سوھنے۔

(چند ڈٹھا وساخ دا)

"قحط سالی ہے اور دوستو کالی قحط سالی۔ نہ تو موسموں کا مزاج ایسا ہے کہ کسی دانا کی سوچ کے مسترد صحیفے کو پھر کون پڑھے' پہاڑ کے گرم خشک دامن میں یہ بستیاں اس طرح سے ہیں جس طرح کسی بچے کے پرانے پیلے چولے کے پھٹے ہوئے دامن میں پرانی مٹی کی گونگی پیالیاں۔ میرے محلے اور میرے وسیب کے بچے خوبصورت گیت بھول گئے ہیں۔"

غزل میں اقبال سوکڑی کی آواز یوں ابھرتی ہے:

ڈڈی مدت توں ڈسدن ڈہر ہر مخلوق گونگی اے
میڈا مالک الاتوں گالھ کر مخلوق گونگی اے

قلم لاوارثی میت نظر دے دل دے تختے تیں
خود اپنے شہر توں لگدا ہے ڈر مخلوق گونگی اے

''اے میرے مالک تو خود ہی بول اور بات کر اس لئے کہ مخلوق گونگی ہے، قلم دل کے تختے پر لاوارث لاش کی طرح نظر آتا ہے اور اب تو اپنے شہر میں بھی ڈر لگتا ہے اس لئے کہ مخلوق گونگی ہے۔''

محسن نقوی کے ہاں ڈر اور خوف کی اسی فضا کے مشاہدے کا نتیجہ ایک سوال کی شکل میں ابھرتا ہے اور وہ علامتی اظہار کے حوالے سے چپ کی اس ساری صورت حال کے بارے میں پوچھتا ہے:

حرفیں دے تیشے دی جنج تے
چٹا کھیر کبوتر بیٹھے
لال اندھاری
بکروال بدل دیاں گاجان
تتی ریت دے بھردے ٹبے
ہر پاسو پتھریں دی واچھڑ
رستے وچ نانگیں دے پہرے
ڈاکو چور اچکے رہزن
کچے کوٹھے کوں سندھ بارن
گھر دا ایرہ
حرفیں دے تیشے دی چنج تے
چٹے کھیر کبوتر کولوں
دل دل پچھے
ھن کیا تھیسی

''حروف کے تیشے کی چونچ پر دودھ کی طرح سفید کبوتر بیٹھا ہے' سرخ آندھی' کالے بادلوں کی گھن گرج' گرم ریت کے بنتے بگڑتے ٹیلے' ہر طرف سے پتھروں کی بارش' راستے میں سانپوں کے پہرے' ڈاکو چور بدمعاش اور رہزن' کچے کوٹھے میں

سوراخ ڈال رہے ہیں، اور گھر کی بنیاد--- حروف کے تیشے کی چونچ پر بیٹھے ہوئے دودھ کی طرح سفید کبوتر سے بار بار پوچھتی ہے اب کیا ہو گا؟"

اس نظم میں اندرونی دشمن اور اپنوں کی سازشوں کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا ہے اور جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اس کی طرف واضح اشارہ ہے۔ عزیز شاہد کے ہاں احتجاج کی کئی شکلیں ہیں وہ جبرو استبداد اور ظلم و ستم ڈھانے والی قوتوں کے خلاف ایک نئے حوالے سے بات کرتا ہے وہ صرف اپنی دھرتی اور اپنے وطن کو بچانے کے جتن نہیں کرتا بلکہ اس کی سوچ بین الاقوامی ہے:

میں صرف شاعر
میں صرف لفظیں دی گونگی دھرتی دا ھک پیغمبر
میں نوح لکھاں---مکان ڈیواں
یتیم دھرتی دے زخم دھوواں
میں کیڑھے کیڑھے وطن کوں رووان

"میں صرف شاعر ہوں، میں لفظوں کی گونگی دھرتی کا ایک پیغمبر--- میں نوحے لکھوں یا تعزیت کروں۔ لاوارث دھرتی کے زخم دھوؤں---میں کس کس وطن کا ماتم کروں۔"

اس نظم میں تو اس کا لہجہ تند اور سخت بن گیا ہے:

سوچو آخر کیوں تھی گئی اے رات اندھاری دھرتی
سوچو کون ان قاتل ساڈے کون ان ساڈے راکھے
اندھا راج رواج اے جتھاں پرہ کینویں باکھے
پر اے راج رواج نئیں رہنا پرہ بھتی آخر
سمجھ سدا نئیں گھن وچ رہنا گھن توں چھٹی آخر
کہ تائیں ساڈا خون چپتیں کوڑھو کتو کانو
دھر دے گونگے دھرتی واسو پل دے پیر سنجانو

"سوچو کہ آخر دھرتی پہ یہ اندھیری رات کیوں اور کیسے آئی ہے؟ سوچو! کون ہمارے قاتل ہیں اور کون ہمارے محافظ، جہاں اندھا راج رواج ہو وہاں طلوع سحر کیسے

ہوگی۔ مگر یہ راج رواج نہیں رہے گا اور صبح طلوع ہو گی۔ سورج ہمیشہ گرہن میں نہیں رہتا' آخر اسے اس سے نکلنا ہے۔ بد شکلو' کتو اور کانو! تم کب تک ہمارا خون پچاؤ گے۔ ازل سے دھرتی کے گونگے باسیو! وقت کے قدموں کی آواز کو پہچانو۔"

عزیز شاہد کی غزل میں بھی اس کا یہی رویہ نظر آتا ہے:

ہن تاں ہر ڈھلدا پچھلواں ظلم دا
آسرا گھند اودے دیوار دا
اے میڈا بیکار ہتھ کڑیاں سنجاں
ول پکڑ گروان کہیں سرکار دا

"اب تو ظلم کا ہر ڈھلتا ہوا سایہ دیوار کا آسرا لے رہا ہے' اے میرے بے کار ہاتھ ہتھکڑیوں کو پہچان اور پھر سرکار کا گریبان پکڑ لے۔"

۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے حوالے سے بھی بہت سے پہلوؤں پر سرائیکی شاعروں نے قلم اٹھایا ہے۔ منیر فاطمی کے ہاں اس طرح کا اظہار ملتا ہے:

اے جنگ جیون چمار دی نئیں
اے جنگ دادو لہار دی نئیں
اے جنگ بھتو کمہار دی نئیں
اے جنگ سرمایہ دار دی ہے
اے جنگ تیڈی نہ میڈی جنگ اے
اے جنگ نسلاں کھا کے رہسی
اے جنگ صدیاں گھنا کے رہسی
اے جنگ غربت ودھا کے رہسی
او جنگ ساکوں ای لڑنی پوسی
او جنگ میکوں وی لڑنی پوسی
اے جنگ تیڈی نہ میڈی جنگ اے

"یہ جنگ جیون چمار کی نہیں' یہ جنگ دادو لوہار کی نہیں' یہ جنگ بھتو کمہار کی نہیں' یہ جنگ سرمایہ دار کی جنگ ہے' یہ جنگ نہ تو تیری ہے نہ میری ہے--- یہ

جنگ نسلوں کو ختم کر کے رہے گی' یہ جنگ صدیوں کو گھٹا کے رہے گی' یہ جنگ غربت میں اضافہ کر کے رہے گی' اب یہ جنگ ہمیں بھی لڑنا پڑے گی' یہ جنگ تمہیں بھی لڑنا پڑے گی۔ یہ جنگ نہ تیری ہے نہ میری جنگ ہے۔"

جنگ کے حوالے سے عاشق بزدار کے ہاں اور قسم کی سوچ دکھائی دیتی ہے کہ دھرتی کے لئے قربانی دینے کا انجام ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ نظم "کورٹ مارشل" میں وہ کہتا ہے:

جنگ دے بعد میں جے کر اپنی وستی ویساں
مار کے دھرتی ماوے نکھڑے ینگر
کیا ونج منہ ڈکھ لیسان
میں اے سوچ تے
رائفل سٹ کے
مورچے وچوں بہر نکھتان
اپنی دھرتی جیس کوں
ناں مارن دے جرم اچ
میڈے ہتھ ہتھ کڑی لگ گئی

"جنگ کے بعد اگر میں ماں دھرتی کے بچھڑے ہوئے جوانوں کو مار کر بستی میں جاؤں گا تو وہاں کیا منہ دکھاؤنگا۔ میں نے یہ سوچ کر بندوق پھینک دی اور مورچے سے باہر نکل آیا۔ اپنی دھرتی کے نہ مارنے کے جرم میں میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگ گئی۔"

انسان کے اسی المیے کی جانب ممتاز حیدر ڈاھرنے اور طریقے سے روشنی ڈالی ہے اور اس کی سوچ کا زاویہ مختلف ہے۔ اس کی نظم اجو کے انسان دا المیہ اور پیش قدمی اس کا ثبوت ہیں:

میں اپنڑے ہوون توں منحرف ہاں
زبان دے سارے ذائقے

جیویوں جو بھکارت دی شہنشاہی دے وچ
نظر بند کر ڈے گین
میں جیڑھی خوشبو دی آس منگداں
نیکی خواہش دے سارے اظہار
اودے بھاگ اچ لکھیج ویندن

(اجو کے انسان دا المیہ)

"میں اپنے ہونے سے منحرف ہوں' زبان کے سارے ذائقے شہنشاہت کی دھونس میں نظر بند کر دیئے گئے ہیں۔ میں جس خوشبو کی امید کرتا ہوں نہ پوری ہونے والی خواہش کے سارے اظہار اس کے نصیب میں لکھ دیئے جاتے ہیں۔"

اسی طرح اس کی نظم پیش قدمی ایک نئے سورج کی بشارت دیتی ہے:

اساڈیونے اکھیں اندھارا منن توں
صاف کر ڈتا ہے
جلو کہیں سجھ دی گول دے وچ
گھریں تو نکلوں
اساڈیاں اکھیں تونیں نہ رہسن
اساڈے بعد آون آلیاں نسلاں تا
سوجھ لے دی اسیں عیسن

"ہماری آنکھوں نے اندھیرے کو ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ چلو کسی سورج کو تلاش کریں اور گھروں سے نکلیں۔ اگرچہ ہماری آنکھیں نہیں رہیں گی' تاہم ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو اجالے کی نعمت مل جائے گی۔"

نصر اللہ ناصر کا احتجاج حسن فطرت اور حب الوطنی کے حوالے سے ہے انہوں نے ان سچائیوں کا اظہار کیا ہے جن کا جبر ہماری تاریخ کا حصہ ہے اس لئے صدیق طاہر نے "اجرک" کے دیباچے میں لکھا ہے "ہمارا شاعر اونچی گدی والے حکمرانوں' سختیاں کرنے والے فاتح لوگوں' استحصال کرنے والے وڈیروں اور سرمایہ داروں کی بجائے عوام کے کندھے کے ساتھ کھڑے ہو کر عام آدمی کے دکھ سکھ کا

ساتھی ہے" اور یہ سچ بھی ہے اور اس کا اظہار اس کی نظموں میں بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ اس کی نظم "نیلسن منڈیلا دی قوم دے ناں" دیکھیں:

تساں کون او کالے لوکو
کس مٹی دے بنڑے ہوئے
سر وچ سودا چاتی پھر دو
من وچ کیہاں ازلی جوگ اے
آزادی دے گاون گاندو
اپنڑا منہ مہاگا منگدو
کھل کھل پیریں سنگل پیدو
نچ نچ اپنڑے یار منیندو
اساں گنگ دا میں کوں ڈیکھو
اساں سونہڑیاں شکلاں والے
کالی گھپ اندھاری رات اچ
سجھ دے گل گلانویں پیندوں

"اے کالے لوگو! تم کون ہو اور کس مٹی سے بنے ہوئے ہو' تمہارے سروں میں سودا سمایا ہوا ہے اور من میں کیسا ازلی جوگ ہے۔ آزادی کے گیت گاتے ہو اور اپنی خواہش کا برملا اظہار کرتے ہو۔ ہنس ہنس کر پیروں میں زنجیریں پہنتے ہو اور ناچ ناچ کر اپنا یار مناتے ہو۔ ہم گونگے لوگوں کو دیکھو' ہماری شکلیں بھی اچھی ہیں مگر ہم کالی اندھیری راتوں میں سورج کی گردن میں بانہیں ڈال دیتے ہیں۔"

اس نظم کے پس منظر میں شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس پر تبصرہ کرنے اور اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس کی نظم ڈانگ دیکھئے جس میں اپنی دھرتی پر حملہ آور کو بھگانے کے عملی اقدام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

میڈھے ویڑھے چپ چپاتے
منڈا سے ماری
پیراں تلے کپالے بدھی

اے ان سونہاں شکلاں والے
میڈھا دھن تے دھنولا کھسن
ان دیاں کلوٹھیاں وند اون
بھامڑے---- بن ریں خالی کرن
کھوئیاں پورن
کون آگئے ہن

لالو----
کتھ اے میڈی کڑالی ڈانگ

"میرے صحن میں خاموشی کے ساتھ پگڑ لپیٹ کر اور پاؤں میں کبالے باندھ کر---- یہ ان جانی شکلوں والے میری دولت اور گائے وغیرہ چھین رہے ہیں۔ میرے غلے کے برتن خالی کر رہے ہیں' بھانڈے بھی خالی کرتے جا رہے ہیں' پانی کی کھوئیاں بند کر رہے ہیں۔ یہ کون لوگ آگئے ہیں۔ لالو! میری ڈانگ کہاں ہے؟"

اشو لال فقیر جدید لب و لہجے کا مسیحا اور سچا شاعر ہے' اور اس کا مجموعہ "چھیڑو ہتھ نہ مرلی" اس کی تازہ اور فکر انگیز سوچوں کے اعتبار سے ایک خاص حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے ہاں احتجاج اور مزاحمت کا ایک نیا زاویہ اور ایک نیا رنگ ہے۔ تہذیبی بازیافت اور کلچرل حوالہ اس کی شاعری کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ اپنے مجموعے کے پیش لفظ میں اس نے لکھا ہے "ہم شاعری کے مکمل شعوری ذمہ داری ہونے کے نظریئے پر یقین رکھتے ہیں اس لئے کہ وہ وسیبی توڑ پھوڑ کے جدلیاتی عمل اپنے وسیب اور مٹی سے پھر جڑ جائے اور یہ کام یقینی طور پر سیاسی ہوتا ہے۔ شاعری کے محض رمز اور معرفت ہونے کے نظریئے کو ہم رد کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ بھی نہیں کہ شاعری کو لاٹھی بنا کر انقلاب کیا جائے۔ اگر صرف لوگوں کو مشتعل کرنے کا نام شاعری ہوتا تو پھر میرے خیال میں شاعری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ صرف گالی دے کر بھی لوگوں کو مشتعل کیا جا سکتا ہے---- چھیڑو ہتھ نہ مرلی کی نظمیں میرے ذاتی ناسٹالجیا کے ساتھ ساتھ میرے وسیب اور اس کی محرومی کا اجتماعی ناسٹالجیا بھی ہے جسے میں نے اپنے گاؤں سے چن لانے تمنا سے پھر سری کیا ہے اور مارشل لاء

میں جوان ہوا ہوں۔"

گویا یہ سطریں اشو لال فقیر کا شعری منشور بھی ہیں اور اس کے تخلیقی اظہار کا شہادت نامہ بھی۔۔۔ اس کی نظم "دھرتی تے دھاڑ دی پہلی رات" میں وہ کہہ اٹھتا ہے:

سنڑدے ہیں کوئی فوجاں لتھن
راجاں تاجاں والیاں
کوٹ فصیلاں اتے نچدن
ہنے گھوڑے سانگاں
اساں وی جے ہل دی اوڑ اچ
چا بارود رھیندے
ساڈے تن تے نیل نہ ہوندے
برھوں بار نہ چیندے

"سنتے ہیں کہ کوئی فوجیں اتری ہیں جس میں راجے تاجے ہیں جو فصیلوں پر رقص کناں ہیں اور ان کے پاس زین گھوڑے اور نیزے ہیں۔ ہم بھی اگر ہل کے ساتھ بارود بوتے تو ہمارے تنوں پر مار کے نشان نہ ہوتے اور نہ ہی دکھوں کا بوجھ اٹھاتے۔"

طاہر تونسوی کی غزلوں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ چند شعر مثال کے طور پر پیش ہیں:

میں اج وی کبدا وداں پچھلے پوہ دے پالے توں
اے ، سال وی تاں گزر دا پئے قضا وانگوں

"میں آج بھی پچھلے پوہ کی سردی سے کانپ رہا ہوں اور یہ سال بھی قضا کی طرح گزر رہا ہے۔"

قاتلیں دی بزم وچ سر دا نوون جرم ہے
وقت دے سلطان توں زخم انا منگدے جلو
چپ دی چادر تانڑتے لکن دا اے ویلھا نئیں
انیڑے مونہوں بول تے انیڑی سزا منگدے جلو

"قاتلوں کی محفل میں سر کا جھکانا جرم ہے۔ وقت کے سلطان سے زخم انا مانگتے چلو۔ چپ کی چادر پہن کر سونے کا اب وقت نہیں ہے۔ اپنی زبان سے خود بول کر اپنی سزا مانگتے چلو۔"

میں ہتھیں نال ساڑیاں ہن اے ساریاں جبر دیاں فصلاں
ڈسا کیوں ظلم دی کھاری ولا سر چاونڑی پئے گی
قلم میڈی داں اے لکھتاں گواہ اوں دور دیان ہن پیاں
جڈاں ھک شخص دے آکھے قلم دی روکنی پئے گی

"میں نے اپنے ہاتھوں جبر کی ساری فصلوں کو جلا دیا تھا' مجھے بتا کہ پھر کیوں ظلم کا بوجھ سر پر اٹھانا پڑ گیا۔ میرے قلم کی یہ تحریریں اس وقت کی گواہ ہیں جب ایک شخص کے کہنے پر قلم بھی روکنا پڑ گئی۔"

آمریت نے جمہوریت کا قتل کرتے ہوئے جو آٹھویں ترمیم نافذ کی اس کی بدولت جمہوری حکومتوں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور آٹھویں ترمیم کا سانپ سب کو ڈس گیا اور اب اس کے خاتمے کے لئے عصائے موسوی کی ضرورت ہے۔ جہانگیر مخلص نے اسے بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنی نظم "اٹھویں ترمیم" میں یوں اظہار کیا ہے:

تیکوں بھل ہے ظالم میں تیڈی اٹھویں ترمیم توں ڈر ویساں
تیکوں بھل ہے تیڈے چاب کھاتے جان دی بازی ہر ویساں
میں جیاں رہندی دنیا تئیں توڑیں جیل دے اندر مر ویساں
میکوں مار تشدد نال بے شک میڈے کتے پھاسی گھاٹ بنڑا
میڈے بال اجاں تئیں جیندے ھن دستور اچ بئی ترمیم کرا
او اندھی نگری دا راجہ توں اپنے سارے شوق منا

"تجھے بھول ہے کہ ظالم میں تمہاری آٹھویں ترمیم سے ڈر جاؤں گا' تمہیں بھول ہے کہ تمہارے کوڑے کھا کر میں جان کی بازی ہار جاؤں گا۔ میں رہتی دنیا تک زندہ رہوں گا خواہ جیل ہی میں کیوں نہ مر جاؤں' چاہے مجھے تشدد سے مار ڈال یا مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھا دے۔ میرے بچے ابھی زندہ ہیں اس لئے دستور میں کوئی اور ترمیم کر۔ اے اندھی نگری کے راجہ! تو اپنے سارے شوق پورے کر لے۔"

اشو لال فقیر نے مارشل لاء کے اثرات اور اس سے پیدا شدہ کیفیات کو اپنی نظموں میں منعکس کیا ہے اور اس کا انعطاف اس کی نظم مارشل لاء میں کچھ اس طرح ہوا ہے:

ادھی راتیں چن پکڑیجے
جنگل وین کرے
تاری تاری پکھدی چپ گن
وستی روز ڈرے
پرے کتھائیں مرلی اتے
ڈکھ دی راند تانگھ اساڈی
رستہ انت کرے
چن دی جان چھٹے

"آدھی رات کا چاند پکڑا گیا' جنگلوں نے ماتم کرنا شروع کر دیا۔ تارہ تارہ خموشی چھا گئی اور اس کی وجہ سے بستی میں خوف پھیل گیا۔ مگر دور کہیں مرلی کی آواز درد بھرے گیت گاتی ہے۔ ہماری بہت پرانی خواہش کہ رستہ صاف ہو اور چاند کی جان چھوٹ جائے۔"

۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو شہید ذوالفقار علی بھٹو کو جس طرح تختہ دار پر لٹکایا گیا اس کے خلاف جو رد عمل اور احتجاج ہوا اسے کئی طریقوں سے کچلا گیا۔ اس نظام کے خلاف آواز بلند کی جاتی رہی' نسرین انجم بھٹی نے اپنی ایک نظم "میں مرزا ساگر سندھ دا" میں اس طرح اظہار کیا ہے:

میں مرزا ساگر سندھ دا
میری راول جنج چڑھی
میں ٹریا سولی چم کے مرے سرتے موت کھلی
میں اک پیڑھی دا بادشاہ تے انھاں دا غلام
میں اڈ اسماناں چلیا میرا ناں اڈار
میری عشق دے نال اشنائی

میری نابری نال امنگ

میری چوراں چترائی

میری نال قصائیاں جنگ

میرے دشمن لکھ عدالتاں

میرے سجناں خبر پڑھی

میں مرزا مہران دا

میری راول جنج چڑھی

"میں ساگر سندھ کا مرزا ہوں' میری بارات راول سے چڑھی۔ میں سولی کو چوم کر چڑھا اور میرے سر پر موت سوار ہوئی۔ میں ایک نسل کا بادشاہ اور آٹھ کا غلام۔ میں آسمانوں کی طرف اڑ کر چلا ہوں میرا نام اڑنے والا ہی ہے۔ میری عشق سے آشنائی ہے' میری مزاحمت کی امنگ ہے' میری چوروں سے چالاکی ہے اور میری قصائیوں سے جنگ ہے۔ لاکھ عدالتیں میری دشمن ہیں' میرے دوستوں نے خبر پڑھی۔ میں مہران کا مرزا ہوں اور راول میں میری بارات چڑھی۔"

اسی طرح اشو لال فقیر کی نظم ۴ اپریل شہید بھٹو کی پھانسی کے بارے میں علامتی اظہار ہے:

اساں کانڈھی بن پچھتانے

ڈکھاں جنج ورتایا

ہنجواں رج رج ویل اگاڑی

موںجھاں ڈاج وچھایا

درد مبلیں کھارے چڑھیا

چڑھ سولی مسکایا

رات کجاوے اندر پا کے

لوکاں سمجھ پرنایا

سمجھ واپس نہ آیا

"ہم باراتی بن کر پچھتا رہے ہیں اور دکھ بارات میں شامل ہوئے' آنسوؤں

نے جی بھر کر ڈیل وصول کی، اداسیوں نے جہیز بچھایا، درد صلیبوں پر چڑھ گیا اور سولی چڑھ کر مسکرایا۔ رات کے کجاوے میں ڈال کر لوگوں نے سورج کی شادی کی مگر سورج واپس نہ آیا۔"

مزاحمتی شاعری کے حوالے سے جہانگیر مخلص کا شعری مجموعہ "پرو بانگھ" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آٹھویں ترمیم کے حوالے سے اس کی ایک نظم پہلے درج کی جا چکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ڈر اور خوف کی فضا ختم کرو، دل میں دھرتی ماں کی محبت کے لئے بولنے کا جذبہ پیدا کرو۔ اس بات کا عملی ثبوت اس نے اپنی نظم "توں مجھ دے ناں" میں فراہم کیا ہے:

جیڑھی ساڈے سرتے رکھی ہئی او پگ ہے پر کیتیاں لیراں
ساڈے گل وچ طوق غلامی دا ساڈے پیراں وچ زنجیراں کیوں
منصف دی ظلم کچہری وچ تصویرا ساں کیوں بنڑویندوں
ہن ضابطے ساڈے رووݨ تے ساڈے بولݨ تے تعزیراں کیوں

"ہمارے سر پر جو پگ رکھی تھی وہ تار تار کیوں ہے؟ ہمارے گلے میں غلامی کے طوق کیوں ہیں اور ہمارے پیروں میں زنجیریں کیوں ہیں؟ منصف کی ظالم کچہری میں ہم تصویر کی مانند کیوں چپ ہیں؟ ہمارے رونے پر پابندیاں اور ہمارے بولنے پر تعزیریں کیوں ہیں؟"

اس کی نظم "ویٖنا حیات دے ناں" بھی معاشرتی اور سماجی ظلم کے خلاف احتجاجی لب و لہجہ سے عکس ریز ہے اور کچھ سوچنے کا تقاضا کرتے ہیں:

پاٹے ہوئے بوچھݨ دیاں توں سبھے لیراں سانبھ رکھ
ایں ملک دی ہر دھی دے ناں ڈیتی ونجیں تمیک توں
ایں جرم تے مجرم دے وچ ہا رابطہ سرکار دا
سوچو تساں وی دور تئیں ڈیکھو ذرا نزدیک توں

"پھٹے ہوئے دوپٹے کی سب تاریں سنبھال کر رکھنا اور اس ملک کی ہر بیٹی کو ورثے میں دے دینا۔ اس جرم کے سلسلے میں مجرم اور سرکار کا رابطہ تھا، تم دور تک سوچو اور نزدیک سے دیکھو۔"

پاکستانی ادب اور مزاحمتی رویے کے حوالے سے سرائیکی شاعری کا یہ ایک منظر نامہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ گزشتہ بارہ تیرہ برسوں کی آمریت نے فرد کی انا اور اس کی عزت نفس کو جس طرح کچل دیا ہے اور جس طرح اس کی زبان پر تالے لگا دیئے ہیں اور اس سے آزادی اظہار کی سہولت بھی چھین لی گئی اور جس طرح سچ بولنے والوں کو زہر پیالے پیش کئے گئے اور پھر جس طرح جسمانی اذیتیں تکالیف اور دکھ دینے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے گئے اس نے باضمیر دانشوروں کے لئے اور بھی مہمیز کا کام کیا اور ان کی صدائے احتجاج دبنے کی بجائے اور بھی ابھرتی چلی گئی اور منفی قوتوں کے خلاف قلمی جہاد کی روایت کو فروغ ملتا رہا۔ اس کے نتیجے میں جمہوریت کش طاقتوں' آمرانہ ذہنیتوں اور فرعونی رویوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کا جو حشر ہوا وقت اس پر ہمیشہ انگشت بدنداں رہے گا۔ قصہ مختصر آج وطن عزیز میں جمہوریت کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ عوام کی اپنی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ ۱۹۹۳ء کے الیکشن میں جنوبی پنجاب نے اپنا ووٹ جمہوریت پسند قوتوں کو دیا مگر مقام تاسف ہے کہ جنوبی پنجاب کے لوگوں کی قسمت ابھی تک نہیں بدلی اگرچہ اقبال سوکڑی نے یہاں تک کہہ دیا ہے:

میڈے باغی قلم کافی ہے سائیں اتنا تاں کر چھوڑے
خدا کوں سوچنا پئے گئے جو میں کیجھاں خدا منگداں

"میرے باغی قلم نے اتنا تو کر دیا ہے کہ اب خدا کو بھی سوچنا پڑ گیا ہے کہ میں کیسا خدا چاہتا ہوں۔"

اس کے باوجود مزاحمت کی فضا موجود ہے۔ سرائیکی دانشوروں کو ایک جنگ کے خاتمے کے باوجود دوسری جنگ کا سامنا ہے۔ دیکھیں عذاب موسم کب جائیں گے اور خوشگوار رتیں کب آئیں گی اور اس کے لئے سرائیکی شاعر کا قلم احتجاجی' مزاحمتی اور مدافعتی ادب تخلیق کرتا رہے گا اور یہ نعرہ بلند ہوتا رہے گا:

اساں قیدی تخت لہور دے ـــــ اساں قیدی تخت لہوار دے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک نخل در آتش اور کار آگاہ محقق ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ایک زمانے سے داد وصول کر چکا ہے۔ وہ تونسہ شریف کے ہیں جو میرے آبائی وطن لیہ اور ڈیرہ غازی خان کے نواح میں واقع ہے اور سرائیکی کا علاقہ ہے۔ سرائیکی اور اردو میں ایک عجیب و غریب ربط و کشش و اتحاد و موانست کا رشتہ ہے اور اس علاقے کے بہت سے فنکاروں نے اردو کی لسانی و علمی حدود کو وسیع کیا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے منتخب مضامین کا مجموعہ ڈاکٹر اسد فیض نے مرتب کیا ہے۔ یہ مضامین ان کی سابقہ مطبوعات سے ماخوذ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر طاہر تونسوی صاحب مسعود حسن رضوی مرحوم کے پائے کے کسی اور ادیب کو بھی مرکز نگاہ بناتے تو ایک اور بہترین مطالعہ وجود میں آجاتا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مضامین بھی علمی و تحقیقی اعتبار سے لائق توجہ ہیں۔ یقین ہے قارئین ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

(گوپی چند نارنگ)